الرسالہ

ISSN 0970-180X

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

محاذ آرائی کا طریقہ اختیار کرنے سے
مسئلہ بڑھتا ہے
اور اعراض کا طریقہ اختیار کرنے سے
مسئلہ پہلے ہی مرحلہ میں ختم ہو جاتا ہے

جون ۱۹۹۱ ▫ شمارہ ۱۷۵ ▫ ۵ روپیہ

تذکیر القرآن

جلد اوّل : سورۃ فاتحہ ۔ سورۃ بنی اسرائیل

جلد دوم : سورۃ الکہف ۔ سورۃ الناس

قرآن کی بے شمار تفسیریں ہر زبان میں لکھی گئی ہیں۔ مگر تذکیر القرآن اپنی نوعیت کی پہلی تفسیر ہے۔ تذکیر القرآن میں قرآن کے اساسی مضمون اور اس کے بنیادی مقصد کو مرکز توجہ بنایا گیا ہے۔ جزئی مسائل اور معلوماتی تفصیلات کو چھوڑتے ہوئے اس میں قرآن کے اصل پیغام کو کھولا گیا ہے اور عصری اسلوب میں اس کے دعوتی اور تذکیری پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔ تذکیر القرآن عوام و خواص دونوں کے لیے یکساں طور پر مفید ہے۔ وہ طالبینِ قرآن کے لیے فہمِ قرآن کی کنجی ہے۔

مکتبہ الرسالہ، نئی دہلی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا

اسلامی مرکز کا ترجمان

جون ۱۹۹۱ □ شمارہ ۱۷۵

AL-RISALA (Urdu) Monthly

The Islamic Centre C-29 Nizamuddin West, New Delhi 110 013, India

Telephone: 611128, 697333 □ Telex: 031-61758 FLSH IN ATT IC

Fax: 91-11-353318, 3312601

Annual Subscription: Inland Rs. 60 □ Abroad US $ 25 (Air Mail)

حج اسپرٹ

حج بامقصد زندگی کا ریہرسل ہے۔ چار ہزار سال پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خدائی مشن کے لیے انتہائی بامقصد زندگی گزاری۔ حتیٰ کہ وہ اس بامقصد زندگی کا ایک مثالی نمونہ بن گئے۔ حضرت ابراہیم پر اس بامقصد زندگی کے سلسلہ میں جو مراحل گزرے، حاجی انھیں مراحل کا علامتی اعادہ کرتا ہے۔ وہ مقرر دنوں میں حضرت ابراہیم کی لمبی تاریخ کو دہرا کر اپنے اندر یہ عزم تازہ کرتا ہے کہ وہ اس معاملہ میں حضرت ابراہیم کو اپنے لیے نمونہ بنائے گا۔ حضرت ابراہیم نے جو کچھ اپنے زمانہ میں اپنے حالات کے اعتبار سے کیا، اسی کو وہ دوبارہ اپنی زندگی میں اپنے حالات کے اعتبار سے ظہور میں لائے گا۔

حج کے تمام مراسم اپنی حقیقت کے اعتبار سے بامقصد زندگی کے مختلف مرحلے ہیں۔ مقصدی زندگی اختیار کرنے کے بعد جو کچھ ایک انسان پر گزرتا ہے، وہ حضرت ابراہیم پر اپنی کامل صورت میں گزرا۔ ہر زمانہ میں اہلِ ایمان کو بامقصد زندگی گزارنے کے لیے دوبارہ یہی سب کچھ کرنا ہے۔ سچا حاجی وہی ہے جو اس نیت اور اس حوصلہ کے ساتھ حج کے مراسم ادا کرے۔

بامقصد زندگی سب سے پہلے شعوری فیصلہ چاہتی ہے، حاجی حج کی نیت کرکے اور احرام پہن کر یہی شعوری فیصلہ کرتا ہے۔ بامقصد زندگی مالی انفاق کی طالب ہوتی ہے، حاجی اپنی پاک کمائی سے سفرِ حج کے اخراجات اٹھا کر اسی مقصدیت کا اظہار کرتا ہے۔ مقصد کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ آدمی متحرک ہو۔ حسب ضرورت وہ ایک مقام سے دوسرے مقام کی طرف سفر کرے، حاجی اپنے وطن سے حجاز کا سفر کرکے اسی شرط کو اپنے ذہن میں تازہ کرتا ہے۔

بامقصد آدمی ایک مرکزی نقطہ مقرر کرتا ہے اور اسی کے گرد اپنی پوری زندگی کو منظم کرتا ہے، حاجی کعبہ کے گرد گھوم کر اسی مقصدی صفت کو اختیار کرنے کے لیے اپنے آپ کو تیار کرتا ہے۔ بامقصد آدمی کو اپنے مقصد کی راہ میں سرگرم ہونا پڑتا ہے، حاجی صفا اور مروہ کے درمیان دوڑ کر اسی سرگرمی کو اپنانے کا اعلان کرتا ہے۔ بامقصد آدمی ہر وہ قربانی پیش کرتا ہے جو اس کا مقصد اس سے طلب کرے، حاجی زمانۂ حج میں جانور کو قربان کرکے اسی بات کا علامتی عہد کرتا ہے۔ بامقصد آدمی دوسرے ہم خیال لوگوں کے ساتھ متحد ہو جاتا ہے تاکہ اس کا عمل زیادہ موثر اور طاقتور ہو سکے، حاجی عرفات کے میدان میں تمام لوگوں کے ساتھ

جمع ہوکر اسی جذبۂ اتحاد کا مظاہرہ کرتا ہے۔ وغیرہ

حج ابتدا ہے، وہ انتہا نہیں۔ اس کی ابتدا مقاماتِ حج میں ہوتی ہے، اور اس کی انتہا اور تکمیل وہاں سے لوٹنے کے بعد حاجی کی اپنی عملی زندگی میں۔

یہ ابراہیمی مقصد دعوت و تبلیغ کا مقصد ہے۔ حضرت ابراہیم کا مشن دعوت الی اللہ کا مشن تھا۔ اسی کے لیے انھوں نے اپنی پوری زندگی کو وقف کیا۔ حج دراصل حضرت ابراہیم کی اسی سنت کو زندہ کرنے کا عزم ہے۔ حقیقی حاجی وہی ہے جو حج کے سفر سے یہ عزم اور یہ حوصلہ لے کر اپنے وطن واپس آئے۔

حضرت ابراہیم نے عراق میں لمبی مدت تک دعوت دی۔ مگر وہاں کے لوگ مشرکانہ تمدن میں اتنا زیادہ غرق ہو چکے تھے کہ وہ توحید کے پیغام کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ صدیوں تک مشرکانہ تمدن کے ماحول میں رہنے کی وجہ سے وہاں کی پوری نسل کا شاکلہ بگڑ گیا تھا۔ اب ضرورت تھی کہ ایک نئی قوم بنائی جائے جو اپنی فطرت پر قائم ہو اور پھر توحید کے پیغام کو قبول کر کے اس کی علم برداری کر سکے۔

حضرت ابراہیم نے اسی قسم کی ایک نئی نسل بنانے کے لیے اپنے بیٹے اسماعیل کو عرب کے بے آب و گیاہ صحرا میں بسا دیا۔ جہاں تمدن سے دور اور فطرت کے ماحول میں پرورش پا کر وہ نسل بنی جس کو بنو اسماعیل کہا جاتا ہے۔ یہی لوگ تھے جو پیغمبر آخر الزماں کے ہاتھ پر ایمان لائے اور ایک طاقت ور ٹیم بن کر ساری دنیا میں موحدانہ انقلاب برپا کیا۔

آج دوبارہ حضرت ابراہیم کی اسی سنتِ دعوت کو زندہ کرنے کی ضرورت ہے۔ آج اسلام کو دوبارہ داعیانِ حق کی ایک ٹیم درکار ہے جو اسلام کے پیغام کو لے کر اٹھے اور اس کو عالمی سطح پر پھیلا دے۔ اب دوبارہ وہ وقت آگیا ہے کہ کچھ لوگ اپنے بیٹوں کو خدا کے دین کی خدمت کے لیے وقف کریں جس طرح حضرت ابراہیم نے اپنے زمانہ میں اپنے بیٹے کو خدا کے دین کی خاطر وقف کیا۔ اسی قربانی سے پہلے بھی خدا کے دین کی تاریخ بنی تھی، آج بھی اسی قسم کی قربانی سے خدا کے دین کی تاریخ دوبارہ ظہور میں آئے گی۔

آج ساری دنیا میں خدا کے دین کی اشاعت کے نئے مواقع پیدا ہوئے ہیں۔ مختلف اسباب کے تحت لوگوں میں یہ رجحان پیدا ہوا ہے کہ وہ دینِ حق کو جانیں۔ اب ضرورت ہے کہ مسلمانوں میں سے کچھ لوگ اس مقصد کے لیے اٹھیں۔ وہ ہر ملک میں جائیں اور وہاں کے باشندوں کو خدا کے دین کا پیغام پہنچائیں۔ مگر یہ دعوتی مواقع عملاً استعمال نہیں ہو رہے ہیں۔ اور اس کی سادہ سی وجہ یہ ہے کہ ہمارے پاس تربیت یافتہ

کارکن نہیں جو دعوت کے اس کام کو موثر طور پر انجام دے سکیں۔

یہ صورت حال بتاتی ہے کہ آج سنت ابراہیمی کو زندہ کرنے کے لیے ہمیں کیا کرنا ہے۔ آج کا اہم ترین تقاضا یہ ہے کہ بڑے پیمانہ پر ایک "تبلیغی درس گاہ" قائم کی جائے۔ اس میں مسلم نوجوانوں کو تعلیم و تربیت کے ذریعہ مذکورہ کام کے لیے تیار کیا جائے۔ اس درس گاہ میں وہ عالمی زبانوں میں لکھنے اور بولنے کی صلاحیت پیدا کریں۔ ملکوں اور قوموں کی تاریخ پڑھیں اور تقابلی طور پر مذاہب کا مطالعہ کریں۔ اس طرح ضروری علوم میں واقفیت پیدا کر کے وہ سارے عالم میں اسی طرح پھیل جائیں جس طرح دور اوّل کے مسلمان خشکی اور تری میں پھیل گئے تھے۔

اس طرح کی ایک تبلیغی درس گاہ میں اپنے ذہین بیٹوں کو داخل کرنا بلاشبہہ والدین کے لیے ایک قربانی ہے۔ مگر آج ابراہیمی سنت کو زندہ کرنے کے لیے اسی قربانی کی ضرورت ہے۔ اس طرح کی ایک تبلیغی درس گاہ اگر قائم ہو تو گویا وہ دور جدید کی ایک وادیٔ غیر ذی زرع ہوگی جہاں ابراہیمی سنت پر عمل کا دعویٰ کرنے والے حاجی اپنی اولاد کو لے جا کر بسائیں گے (ابراہیم ۳۷)

آج کے حاجی کو یہ ضرورت نہیں کہ وہ اپنی اولاد کو کسی ریگستان میں لے جا کر بسائے۔ آج اس کو صرف یہ کرنا ہے کہ وہ اپنی اولاد کو ذاتی خدمت کے دائرہ سے نکال کر دینی خدمت کے دائرہ میں بھیجے۔ وہ اپنے بیٹے کو اسلامیات کی تعلیم دے۔ اسی کے ساتھ وہ اس کو وقت کی زبان اور علوم سے واقف کرائے۔ اور پھر اس کو موقع دے کہ وہ اپنے ماحول سے نکل کر اقوام عالم کے درمیان پہنچے اور ان کو طاقت ور انداز میں خدا کے دین کا مخاطب بنائے۔

آج اسلامی دعوت کو دوبارہ تازہ دم کارکنوں کی ایک ٹیم درکار ہے۔ یہ ٹیم دوبارہ ابراہیمی قربانی ہی کے ذریعہ بن سکتی ہے۔ حج کے مناسک اسلام کی اسی ضرورت کا عالمی اعلان ہیں۔ کیا کوئی ہے جو حج کی اس پکار کو سنے، کیا کوئی ہے جو اس پکار کی طرف دوڑے، اور دوبارہ ابراہیمی سنت کو زندہ کر کے اسلام کی نئی تاریخ بنائے۔

یہی حج اسپرٹ ہے، اور اسی حج اسپرٹ کو زندہ کرنا حاجیوں کا سب سے بڑا کام۔

ایک پیغام

کشمیر کے کچھ نوجوانوں نے پوچھا کہ کشمیر کے لیے آپ کا پیغام کیا ہے۔ میں نے کہا کہ کشمیر کے بارہ میں میری ایک ہی رائے ہے جس کو میں ۱۹۶۷ سے بار بار ظاہر کرتا رہا ہوں۔ وہ یہ کہ ان کے مسئلہ کا حل حقیقت پسندی میں ہے نہ کہ جذباتی نعروں اور ٹکراؤ کی سیاست میں۔

ایک طرف قرآن و حدیث اور دوسری طرف تاریخ کے مطالعہ سے میں نے یہ بات پائی ہے کہ یہ دنیا ان لوگوں کے لیے ہے جو حقائق کو سمجھیں اور ان کی رعایت کرتے ہوئے سنجیدہ انداز میں اپنی زندگی کی تعمیر کریں۔ حقائق سے بے پروا ہو کر جذباتی اقدام کرنا صرف اپنی بربادی میں اضافہ کرنا ہے، اس کے سوا اور کچھ نہیں۔

موجودہ دنیا میں زندگی کی تعمیر کے لیے جن حقیقتوں کو سمجھنا ہے، ان میں سے ایک اہم حقیقت یہ ہے کہ عمل کسی پُرجوش اقدام کا نام نہیں۔ عمل دراصل نام ہے مواقع کو جان کر انھیں استعمال کرنے کا۔ آپ ممکن سے آغاز کر کے ناممکن تک پہنچ سکتے ہیں۔ لیکن اگر آپ نے ناممکن سے آغاز کیا تو آپ ممکن کو بھی کھو دیں گے، اور ناممکن تو پہلے ہی سے آپ کے لیے کھویا ہوا تھا۔

دوسری اہم حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں کوئی چیز جو آدمی کو ملتی ہے، وہ اہلیت کی بنیاد پر ملتی ہے۔ یہاں کوئی بھی چیز مطالبہ یا توڑ پھوڑ کے ذریعہ حاصل نہیں کی جا سکتی۔ اس دنیا میں جس شخص یا قوم کو کچھ لینا ہے وہ پُرامن تعمیری جدوجہد کے ذریعہ اس کی اہلیت اپنے اندر پیدا کرے۔ اس کے بعد یقینی طور پر وہ اپنی مراد کو پالے گا۔ یہاں کسی کے لیے نہ پانا ابدی ہے اور نہ کھونا ابدی۔

اس دنیا میں کوئی کسی سے نہیں چھینتا، ہر ایک خود اپنے آپ کو محروم کرتا ہے۔ اس دنیا میں کوئی کسی کو دھوکا نہیں دیتا، ہر ایک خود اپنی نادانی سے دھوکا کھاتا ہے۔ یہاں ناکامی یہ ہے کہ آدمی زندگی کے مقابلہ میں نا اہل ثابت ہو، اور کامیابی یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو اہل ثابت کر کے آگے بڑھ جائے۔

اس دنیا میں صحیح اقدام وہ ہے جس کا ہر دن آدمی کو کچھ اور آگے بڑھاتا ہو۔ جو اقدام آدمی کو پیچھے لے جانے کا سبب بنے، وہ اقدام ہی نہ تھا۔ وہ خودکشی کی ایک چھلانگ تھی جس کو کم فہمی کی بنا پر اقدام سمجھ لیا گیا۔

(۲۹ اپریل ۱۹۹۱)

سیاست نہیں آخرت

یہ ۲۷ ستمبر ۱۹۷۲ کا واقعہ ہے۔ مولانا سید اسعد مدنی، صدر جمعیۃ علماء ہند مصر اور سعودی عرب کے سفر سے واپس لوٹے تھے۔ مسجد عبد النبی (نئی دہلی) میں ایک مجلس تھی۔ لوگ مولانا سے سوال کر رہے تھے اور مولانا لوگوں کو ان کے سوال کا جواب دے رہے تھے۔ سوالات کے دوران ایک صاحب نے پوچھا: مولانا موجودہ حالات میں مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیے۔ مولانا اسعد مدنی نے اس کے جواب میں کہا:

"مسلمان جب تک سیاست کے غم میں مبتلا رہے گا، وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ یہ اسلام کی نہایت غلط تشریح ہے کہ انبیاء علیہم السلام سیاسی نظام قائم کرنے کے لیے آتے تھے۔ انبیاء کے سامنے اصلاً آخرت ہوتی تھی۔ وہ لوگوں کو خدا کے غضب سے ڈراتے تھے۔ ان کا حال اس باپ کا سا ہوتا تھا جس کا لڑکا آگ کے شعلہ میں گر رہا ہو اور وہ اس کو اس سے کھینچنے کی کوشش کرے۔ اس سلسلہ میں سب سے بڑا نقصان مسلم لیگ نے پہونچایا ہے۔ تقسیم کی تحریک نے نفرت کی جو آگ پھیلائی، اس نے ملک کے دونوں فرقوں کو ایک دوسرے سے اتنا دور کر دیا کہ اب ہماری کوئی بات صحیح روشنی میں دیکھی نہیں جاتی۔ تعصب کے جواب میں جو تعصب پیدا ہوا، اس نے ساری راہیں مسدود کر دیں۔ میں نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ (مولانا سید حسین احمد مدنی) سے سنا ہے کہ کلکتہ کی مسجد جو مسجد ناخدا کے نام سے مشہور ہے، صرف اس ایک مسجد میں تقسیم سے پہلے یہ حال تھا کہ ہر روز تقریباً ایک سو آدمی آکر اسلام قبول کرتے تھے (تقسیم سے پہلے کچھ دنوں تک مولانا حسین احمد مدنی مسجد ناخدا میں خطیب تھے) یہی کیفیت پہلے سارے ملک میں تھی۔ ہر روز لوگ سیکڑوں کی تعداد میں اسلام کے حلقہ میں داخل ہو رہے تھے۔ یہ سب کچھ تقسیم کی منافرت کی پالیسی کے نتیجہ میں ختم ہو گیا" (الجمعیۃ ویکلی، دہلی، ۲۴ مارچ ۱۹۷۳، صفحہ ۳)

موجودہ مسلمانوں کی سب سے بڑی غلطی یہی ہے۔ مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ ہر قیمت پر دعوت کے مواقع کو دوبارہ زندہ کریں۔ اگر انھوں نے ایسا نہیں کیا تو اندیشہ ہے کہ وہ خدا کے قانون کی زد میں آجائیں گے اور پھر کوئی چیز نہ ہوگی جو انھیں خدا کی پکڑ سے بچا سکے۔

جنّت، جہنّم

عن ابی ھریرۃ، قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم : ما رأیتُ مثلَ النارِ نام ھاربُھا وما رأیتُ مثلَ الجنۃِ نام طالبُھا۔

(رواہ الترمذی)

ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ میں نے جہنّم جیسی چیز نہیں دیکھی جس سے بھاگنے والا سو گیا ہو۔ اور میں نے جنّت جیسی چیز نہیں دیکھی جس کا چاہنے والا سو گیا ہو۔

آدمی کو سب سے زیادہ جہنّم سے بھاگنا چاہیے۔ مگر آدمی جہنّم کے مسئلہ کو بالکل بھولا ہوا ہے۔ آدمی کو سب سے زیادہ جنّت کا طالب بننا چاہیے، مگر اس کے اندر جنّت کو حاصل کرنے کا کوئی شوق نہیں۔ یہی دو لفظ میں تمام انسانوں کی کہانی ہے۔

انسانوں کا یہ حال کیسا عجیب ہے۔ لوگ احساس کے درجہ میں بھی جہنّم سے اندیشہ ناک نہیں۔ لوگ تمنّا کے درجہ میں بھی جنّتِ خداوندی کے طالب نہیں۔ ایسی حالت میں یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ جہنّم کی آگ سے نجات پائیں اور ان کے لیے جنّت کی نعمتوں کے دروازے کھولے جائیں۔

لوگوں کے اندیشے کسی اور چیز کے لیے ہیں۔ ان کے جذبات کسی اور بات پر بھڑکتے ہیں۔ ان کے اندر چھپے ہوئے خوف اور امید کے جذبات کسی اور چیز کے لیے وقف ہیں۔ ایسی حالت میں کیوں کر ایسا ہو سکتا ہے کہ وہ خدا کی رحمتوں کے مستحق قرار دیے جائیں۔

مسئلۂ دنیا کو لوگوں نے اپنا مسئلہ بنا رکھا ہے۔ مسئلۂ آخرت کو کسی نے اپنا مسئلہ نہیں بنایا۔ دنیا کی دولت، دنیا کی قیادت، دنیا کی مقبولیت، دنیا کی نیک نامی، یہی سب چیزیں لوگوں کی توجہات کا مرکز ہیں۔ آج کی دنیا میں کوئی نہیں جو آخرت کی بخشش اور آخرت کی نجات کے معاملہ میں فکر مند ہو۔ آخرت کے عذاب کا خوف اور آخرت کی جنّت کی حرص جس کو سراسیمہ بنا دے۔

آہ وہ دنیا، جہاں سب کچھ ہو، مگر وہی چیز نہ ہو جس کو سب سے زیادہ ہونا چاہیے۔ آہ وہ انسان، جو سب کچھ جانے، مگر وہی بات نہ جانے جس کو اسے سب سے زیادہ جاننا چاہیے۔ یہ بلاشبہ سب سے بڑی بھول ہے۔ ایک وقت آئے گا کہ آدمی اپنی اس بھول کو جانے گا۔ مگر وہ جاننا صرف حسرت کے لیے ہوگا نہ کہ کھوئے ہوئے کی تلافی کے لیے۔

زیادہ صحیح اصول

ٹیپو سلطان ۱۷۸۲ سے لے کر ۱۷۹۹ تک ریاست میسور کے حکمراں تھے۔ اسی زمانہ میں انگریز ہندستان پر قبضہ حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ چنانچہ ٹیپو سلطان کا مقابلہ انگریزوں سے پیش آیا۔ ٹیپو سلطان تنہا اس پوزیشن میں نہ تھے کہ وہ انگریز کی جدید فوجوں کا مقابلہ کر سکیں۔ انھوں نے کوشش کی کہ فرانس کو ایک انگریز مخالف معاہدہ میں شریک کریں، مگر فرانس راضی نہ ہو سکا۔ اس کے بعد انھوں نے عرب، کابل، قسطنطنیہ، ماریشس کی حکومتوں کے پاس اپنے وفود بھیجے تاکہ ان سے انگریز کے مقابلہ میں فوجی تعاون حاصل کریں، مگر اس میں بھی انھیں کامیابی نہیں ہوئی۔ اسی طرح انھوں نے ہندستان کی اس وقت کی ریاستوں کو انگریز مخالف مہم میں اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی، مگر ریاستوں نے اس کو خودکشی کے ہم معنی سمجھا۔ چنانچہ کوئی ریاست اس کے لیے تیار نہ ہو سکی۔

آخر کار ٹیپو سلطان تنہا انگریزوں سے لڑ گئے۔ نتیجہ پہلے سے معلوم تھا۔ ۴ مئی ۱۷۹۹ کو سرنگاپٹم میں انگریز کی گولی نے ان کا خاتمہ کر دیا۔ ٹیپو کی یہ جنگ یقینی طور پر بے فائدہ تھی۔ تاہم ٹیپو سلطان نے یہ کہہ کر اس کو صحیح قرار دیا کہ: شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سال کی زندگی سے بہتر ہے۔

ٹیپو سلطان کا یہ جملہ مسلم شاعروں اور خطیبوں کو بہت پسند ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس جملہ میں بہادری ضرور ہے۔ لیکن اس میں بصیرت اور دانشمندی نہیں۔ اگر یہ کوئی مطلق طور پر اعلیٰ اصول ہو تو پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب (مہاجرین) کو مکہ میں شیر کی طرح لڑ کر شہید ہو جانا چاہیے تھا، نہ کہ وہ ایک ایسا طرز عمل اختیار کریں جس نے اغیار کو یہ موقع دیا کہ وہ اس کو "فرار" سے تعبیر کرنے لگیں۔

اس کے برعکس مثال حیدرآباد کے نظام علی خاں کی ہے۔ حالات کو دیکھتے ہوئے انھوں نے ۱۷۶۸ میں انگریزوں سے صلح کا معاہدہ کر لیا۔ ان کی ریاست بدستور قائم رہی۔ اس طرح ریاست حیدرآباد کو موقع ملا کہ وہ ۱۷۶۸ سے لے کر ۱۹۵۶ تک مسلمانوں اور اسلامی اداروں کی غیر معمولی خدمت کر سکے۔

ٹیپو سلطان کے مذکورہ قول کے مقابلہ میں زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ ایک دن کے لیے "گیدڑ" بن جانا آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ سو سال تک "شیر" بن کر رہ سکے۔

سامانِ آزمائش

ایک طالب علم امتحان ہال میں داخل ہوتا ہے۔ وہاں اس کے لیے مکان ہے۔ میز اور کرسی ہے۔ خادم ہے۔ روشنی اور پانی ہے۔ اور دوسری بہت سی چیزیں ہیں۔ مگر طالب علم ان میں سے کسی چیز کا مالک نہیں۔ امتحان ہال کی تمام چیزیں اس کے لیے سامانِ امتحان ہیں نہ کہ سامانِ ملکیت۔ امتحان دینے کی مقرر مدت تک اس کو ان چیزوں پر تصرّف کا اختیار ہے۔ امتحان کی مقرر مدت ختم ہوتے ہی اس کو یہاں سے رخصت کر دیا جاتا ہے۔

ایسا ہی معاملہ انسان کا پوری دنیا کی نسبت سے ہے۔ موجودہ دنیا کی کوئی چیز انسان کی ملکیت نہیں۔ یہاں کی تمام چیزیں اس کو سامانِ امتحان کے طور پر دی گئی ہیں۔ آدمی جس جسم کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ زمین و آسمان کے جس نظام سے وہ فائدہ اٹھاتا ہے۔ حتی کہ جو چیزیں وہ بظاہر محنت کر کے حاصل کرتا ہے، سب کی سب خدا کی طرف سے ہیں، اور سب کی سب امتحان کے سامان کے طور پر اس کو دی گئی ہیں۔ وہ موت کے وقت تک ان کو استعمال کرنے کا حق رکھتا ہے۔ موت آتے ہی اس کا یہ حق مکمل طور پر ختم ہو جاتا ہے۔

امتحان ہال میں جو طالب علم داخل ہوتا ہے، اس کا امتحان یہ ہے کہ وہ پرچہ میں دیئے ہوئے سوالات کو حل کرتا ہے یا نہیں۔ اگر اس نے ان سوالات کو حل کر دیا تو وہ کامیاب ہے۔ اور اگر اس نے ان سوالات کو حل نہیں کیا تو ناکام۔

دنیا کی نسبت سے جو امتحان ہے وہ یہ ہے کہ ہمارا خالق یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ ہم ان چیزوں کو پاکر ان کے درمیان کیسا عمل کرتے ہیں (یونس ۱۴) ہمارا خالق ہم کو سامانِ حیات دے کر اور ان میں ہم کو آزاد چھوڑ کر ہم کو آزما رہا ہے کہ آیا ہم اس کے شکر گزار بندے بنتے ہیں یا ناشکری کا رویہ اختیار کرتے ہیں (النمل ۴۰)

موت سے پہلے امتحان کا دور ہے، موت کے بعد جزاء کا دور۔ موت سے پہلے کی زندگی میں جو آدمی شکر گزاری کا طریقہ اختیار کرے گا، اس کے لیے موت کے بعد کے دورِ حیات میں ابدی جنت ہے۔ اور موت سے پہلے کی زندگی میں جو آدمی ناشکری کا طریقہ اختیار کرے گا، اس کے لیے موت کے بعد کے دورِ حیات میں ابدی جہنّم۔

آدھا آدمی

ایک صاحب سے بات کرتے ہوئے میں نے کہا ——— موجودہ زمانہ میں جس آدمی کا بھی میں نے تجربہ کیا، اس کو میں نے آدھا آدمی پایا، کوئی پورا آدمی مجھ کو نہیں ملا۔ ہر آدمی مسٹر ففٹی پرسنٹ تھا، کوئی آدمی بھی مسٹر ہنڈرڈ پرسنٹ نہ تھا۔

ہر آدمی اُس سچائی کو جاننے کا ماہر تھا جس کی زد دوسرے کے اوپر پڑ رہی ہو۔ جس سچائی کی زد خود اپنے آپ پر پڑے، اس کو جاننے کے لیے کوئی ماہر نہیں۔ ہر آدمی صرف اس وقت تک خوش اخلاق تھا جب تک اس کی پسند کے مطابق باتیں کی جائیں، پسند کے خلاف باتیں کرنے کے بعد کوئی آدمی بھی خوش اخلاق نہیں۔ اپنے انٹرسٹ کو سمجھنے کے معاملہ میں ہر آدمی ہوشیار تھا۔ مگر دوسروں کے انٹرسٹ کو سمجھنے کے معاملہ میں ہر آدمی بیوقوف۔

آج کی دنیا میں ہر آدمی اصول کی باتیں کرتا ہے، مگر عملی اعتبار سے ہر آدمی بے اصول بنا ہوا ہے۔ دوسروں کے سامنے ہر آدمی عزیمت کی تقریر کر رہا ہے، مگر خود ہر آدمی رخصت کو اپنا مذہب بنائے ہوئے ہے۔ باتوں کے میدان میں ہر آدمی آگے ہے، اور عمل کے میدان میں ہر آدمی پیچھے۔

ہر آدمی ظالم ہے، مگر ہر آدمی اپنے کو مظلوم بتا رہا ہے۔ ہر آدمی مفاد کے لیے دوڑ رہا ہے۔ مگر ہر آدمی حق کا تاج اپنے سر پر رکھے ہوئے ہے۔ ہر آدمی جھوٹ پر کھڑا ہوا ہے، مگر ہر آدمی سچ کا لبادہ پہن کر لوگوں کے سامنے آتا ہے۔ ہر آدمی غیر سنجیدہ ہے، مگر ہر آدمی سنجیدگی کا مکھوٹا اپنے چہرہ کے اوپر ڈالے ہوئے ہے۔ ہر آدمی اپنی ذات کے لیے سرگرم ہے، مگر ہر آدمی اعلان کر رہا ہے کہ وہ صرف دین اور ملت کی خدمت کے لیے اٹھا ہے۔

ہر آدمی اندھیرا بکھیر رہا ہے، مگر ہر آدمی اُجالے کی باتیں کرتا ہے۔ ہر آدمی خزاں کا نمائندہ ہے، مگر ہر آدمی اپنے آپ کو بہار کا نقیب بتا رہا ہے۔ ہر آدمی تخریب کاری کی اسکیم چلا رہا ہے، مگر ہر آدمی تعمیر کا جھنڈا بلند کیے ہوئے ہے۔ ہر آدمی لوگوں کو موت کے غار میں دھکیل رہا ہے، مگر ہر آدمی اپنے آپ کو زندگی کا شہسوار بنائے ہوئے ہے۔

اگر لوگ وہی کہیں جو انھیں کرنا ہے، اور وہی کریں جو انھوں نے کہا ہے تو کم از کم وہ صاف گوئی کا کریڈٹ پالیں۔ مگر موجودہ صورت میں تو لوگوں کو کسی بھی قسم کا کوئی کریڈٹ ملنے والا نہیں۔

آہ وہ دنیا جہاں ہر آدمی آدھا ہو، مگر ہر آدمی اپنے آپ کو پورا بتا رہا ہو۔

پہچان کا فرق

مکی دور کے آخر میں جو واقعات پیش آئے، ان میں سے ایک واقعہ یہ ہے کہ ایک بار قریش مکہ کے سردار کعبہ کے اندر جمع ہوئے۔ انھوں نے باہمی مشورہ سے یہ طے کیا کہ محمدؐ کو بلا کر ان کے سامنے کچھ مطالبے رکھے جائیں۔ اگر وہ ان مطالبوں کو پورا کر دیں تو ہم لوگ ان کا پیغمبر ہونا مان لیں۔ اور اگر وہ ان مطالبوں کو پورا نہ کریں تو ہمارے لیے ان کو رد کرنے کا معقول عذر ہو جائے گا۔ چنانچہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بلایا۔ اس موقع پر انھوں نے آپ سے جو مطالبے کیے، ان میں سے ایک مطالبہ یہ تھا:

ولیبعث لنا من مضیٰ من اٰبائنا۔ ولیکن فیما یبعث لنا منہم قصیٌّ بن کلاب فانہ کان شیخا صدوقا، فنسألہم عما تقول احقٌّ ھو ام باطل (سیرۃ ابن کثیر، المجلد الاول، صفحہ ۴۸۰)

(اپنے رب سے کہیے) وہ ہمارے باپ دادا کو زندہ کر دے جو کہ گزر گیے۔ اور جن کو وہ زندہ کرے ان میں قصی بن کلاب بھی ضرور ہوں، کیوں کہ وہ بزرگ اور سچے تھے۔ پس ہم ان سے اس کی بابت پوچھیں جو تم کہتے ہو کہ وہ حق ہے یا باطل ہے۔

یہاں یہ سوال ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تو تمام بزرگوں سے زیادہ بزرگ اور تمام سچے لوگوں سے زیادہ سچے تھے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ قدیم مکہ کے لوگوں کو قصی بن کلاب کا بزرگ اور سچا ہونا سمجھ میں آیا، مگر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا بزرگ اور سچا ہونا ان کی سمجھ میں نہ آسکا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ قصی بن کلاب کی شخصیت ایک گزری ہوئی شخصیت تھی۔ زمانہ کے ساتھ ان کی حیثیت لوگوں کی نظر میں مسلّم ہو چکی تھی۔ اس کے مقابلہ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی شخصیت ایک معاصر شخصیت تھی۔ آپ کی بزرگی اور سچائی، اپنی تمام تر رفعتوں کے باوجود، ابھی ایک شخص کے اندرونی جوہر کی حیثیت رکھتی تھی۔ اُس وقت تک وہ خارجی تاریخ کے ذریعہ معروف و مسلّم نہیں بنی تھی۔

اہل کفر صرف خارجی تاریخ کو دیکھ سکتے تھے، وہ پیغمبر کو پہچاننے میں ناکام رہے۔ اہل ایمان نے اندرونی جوہر کی سطح پر پہچانا، اس لیے وہ پیغمبر کو فوراً پہچان گیے اور آپ پر ایمان لائے۔ آنکھ والا صرف وہ ہے جو کسی انسان کو اس کے جوہر کی بنیاد پر پہچانے۔ وہ شخص اندھا ہے جو کسی انسان کو صرف اس وقت پہچانے جب کہ اس کے گرد تاریخ کی تصدیقات جمع ہو چکی ہوں۔

ہدیۂ رحمت

قرآن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: وما ارسلناك الا رحمة للعالمين (ہم نے تم کو عالم والوں کے لیے صرف رحمت بنا کر بھیجا ہے) حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ آپ سے کہا گیا کہ اے خدا کے رسولؐ، مشرکین کے خلاف بد دعا کیجیے۔ آپ نے فرمایا کہ میں لعنت کرنے والا بنا کر نہیں بھیجا گیا ہوں، میں تو رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں (انی لم ابعث لعانا وانما بعثت رحمة)

حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں اللہ کی رحمت ہوں جو ہدیہ کے طور پر بندوں کے پاس بھیجی گئی ہے۔ دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں:

عن ابن عمر قال، قال رسول اللہ صلی اللہ عليه وسلم: ان اللّٰہ بعثنی رحمة مهداة بعثت برفع قوم وخفض آخرين (تفسیر ابن کثیر ۳/۲۰۱)

عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اللہ نے مجھ کو رحمت اور ہدیہ بنا کر بھیجا ہے۔ میں ایک قوم کی بلندی اور دوسری قوم کی پستی کے ساتھ بھیجا گیا ہوں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت کے لیے نمونہ ہیں۔ نیز ختم نبوت کے بعد آپ کی امت آپ کی نیابت کے مقام پر ہے۔ اب امت کو اقوام عالم کے لیے وہی کچھ بننا ہے جو آپ اپنی زندگی میں لوگوں کے لیے بنے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دوسری اقوام کے لیے خدا کی طرف سے رحمت اور تحفہ تھے، اب آپ کی تبعیت میں آپ کی امت کو بعد کی قوموں کے لیے اسی طرح رحمت اور تحفہ بننا ہے۔ اس ذمہ داری کو ادا کیے بغیر اس امت کا امت محمدی ہونا متحقق نہ ہوگا۔

امت محمدی کو دوسروں سے مانگنا نہیں ہے بلکہ دوسروں کو دینا ہے۔ انھیں لوگوں کے لیے خدا کا ہدیۂ رحمت بننا ہے۔ انھیں اس طرح رہنا ہے کہ ان سے اہل عالم کو نفع بخشی کا تجربہ ہو نہ کہ ضرر رسانی کا۔

اس مقصد کے لیے امت کو صبر کرنا ہے تاکہ وہ چھننے کے باوجود دے۔ تاکہ وہ زیادتیوں کے باوجود لوگوں کی خیر خواہ بنے۔ تاکہ ظلم کے باوجود وہ اپنے آپ کو انتقام کے جذبہ سے پاک رکھے۔ صبر و برداشت کی صفت کے بغیر وہ امتحان کی اس دنیا میں دوسروں کے لیے ہدیۂ رحمت نہیں بن سکتی۔ اور جب تک وہ دوسروں کے لیے رحمت نہ بنے، خود اس کے اوپر بھی خدا کی رحمت کے دروازے بند رہیں گے۔

تنقید

لوگ اپنے خلاف تنقید سے اتنا زیادہ برہم کیوں ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ تنقید کو توہین سمجھ لیتے ہیں۔ اگر وہ تنقید کو اختلاف رائے کے معنی میں لیں تو کبھی تنقید کو سن کر برہم نہ ہوں۔

آدمی کے اندر سب سے زیادہ طاقت ور جذبہ یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو باعزت دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ کسی حال میں اپنی بے عزتی کو پسند نہیں کرتا۔ جب وہ اپنے خلاف تنقید کو سنتا یا پڑھتا ہے تو مذکورہ نفسیات کی بنا پر تنقید اس کو اپنے عزت اور وقار پر حملہ معلوم ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تنقید کو سنتے ہی فوراً مشتعل ہو جاتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اپنا سارا غصہ ناقد کے اوپر انڈیل دے۔

تنقید بلاشبہ انسان کے لیے سب سے زیادہ کڑوی چیز ہے۔ اس میں عوام اور خواص کا کوئی فرق نہیں۔ صرف دو قسم کے انسان ہیں جو تنقید کے موقع پر غیر معتدل ہو جانے سے بچ سکتے ہیں۔

ایک وہ انسان جو بہت زیادہ خدا سے ڈرنے والا ہو۔ یہ وہ انسان ہے جو خدا کی عظمتوں کو اتنی گہرائی کے ساتھ پاتا ہے کہ اپنا وجود اس کی نظر میں سراسر بے عظمت ہو جاتا ہے۔ وہ خدا کو بڑا مان کر اپنے آپ کو چھوٹا بنا چکا ہوتا ہے۔ اُس کا یہ مزاج اِس میں رکاوٹ بن جاتا ہے کہ وہ تنقید کو سن کر بھڑ اٹھے۔ تنقید اگر اس کو چھوٹا کرے تو وہ کیوں غضب ناک ہوگا، جب کہ اِس سے پہلے وہ خود اپنے آپ کو چھوٹا کر چکا ہے۔

دوسرا انسان جو تنقید سے برہم نہیں ہوتا، وہ انسان وہ ہے جس کے اندر حقیقی معنوں میں سائنسی مزاج پیدا ہو گیا ہو۔ سائنس نام ہے حقائق خارجی کے مطالعہ کا۔ سائنس داں کا ذہن یہ ہوتا ہے کہ حقیقت وہ ہے جو خارج میں پائی جائے۔ نہ کہ وہ جو اس کے اپنے ذہن کے اندر موجود ہو۔ یہ سائنٹفک مزاج آدمی سے اس کی خود پسندی چھین لیتا ہے، اور اس کو پوری طرح واقعیت پسند بنا دیتا ہے۔ اس مخصوص مزاج کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب سائنس داں کے سامنے کوئی تنقیدی بات کہی جاتی ہے تو وہ اپنی ذات کو الگ کر کے اسے دیکھتا ہے۔ اس کا دھیان اس کی اصلیت کی طرف چلا جاتا ہے نہ کہ اس طرف کہ وہ اُس کی ذات کو مجروح کر رہی ہے۔

جو شخص تنقید کو سن کر بھڑک اٹھے وہ صرف یہ ثابت کر رہا ہے کہ اس کے اندر نہ سچا تقویٰ ہے اور نہ سچا علمی مزاج۔ اگر اس پر تنقید کی گئی تو واقعتہً وہ اسی قابل تھا کہ اس پر تنقید کی جائے۔

مومن کا طریقہ

صحیح البخاری کی "کتاب التفسیر" میں قرآن سے متعلق بہت سی روایتیں جمع کی گئی ہیں۔ سورہ الحجرات کی تفسیر کے تحت ایک واقعہ دو واسطوں سے نقل کیا گیا ہے۔

ابن ابی مُلیکہ کہتے ہیں کہ قریب تھا کہ دو اصحاب خیر ہلاک ہو جائیں۔ یعنی ابوبکر اور عمر۔ ان دونوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس اپنی آوازیں بلند کیں۔ یہ اس وقت ہوا جب کہ بنوتمیم کا وفد مدینہ آیا۔ ابوبکر نے کہا کہ القعقاع بن مَعبد کو ان کا امیر بنائیے۔ عمر نے کہا کہ الاقرع بن حابِس کو ان کا امیر بنائیے۔ پھر ابوبکر نے عمر سے کہا کہ تم نے صرف میری مخالفت کے لیے ایسا کہا ہے۔ عمر نے جواب دیا کہ میرا مقصد تمہاری مخالفت نہیں۔ پھر دونوں بحث کرنے لگے۔ یہاں تک کہ ان کی آوازیں اونچی ہوگئیں۔ اس پر یہ آیت اتری کہ اے ایمان والو، تم اللہ اور اس کے رسول کے آگے نہ بڑھو۔ اور اللہ سے ڈرو۔ بے شک اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔ اے ایمان والو، تم اپنی آوازیں پیغمبر کی آواز سے اوپر مت کرو ...... ایسا نہ ہو کہ تمہارے اعمال حبط ہو جائیں اور تم کو خبر بھی نہ ہو (الحجرات ۱-۲)

ابن الزبیر کہتے ہیں کہ اس کے بعد عمر کا یہ حال ہوا کہ وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس اس طرح بولتے کہ پوری طرح سنائی نہ دیتا اور رسول اللہ دوبارہ پوچھتے کہ تم نے کیا کہا (فما كان عمر يُسمع رسولَ الله صلى الله عليه وسلم بعد هٰذه الآية حتى يَستَفهِمَهُ)

یہی مومن کا طریقہ ہے۔ مومن بے خبری میں خدا و رسول کی آواز پر اپنی آواز بلند کر سکتا ہے۔ مگر جیسے ہی اس کو بتایا جائے وہ فوراً اپنی آواز پست کر لیتا ہے۔ وہ اپنی آواز کو خدا و رسول کی آواز کے مقابلہ میں نیچا کر لیتا ہے۔

یہ صرف زمانۂ رسول کی بات نہیں۔ آج بھی اہلِ ایمان سے یہی مطلوب ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ پہلے براہِ راست رسولِ خدا کے ذریعہ اس کو متنبہ کیا جاتا تھا۔ آج قرآن و حدیث کے حوالے سے کوئی دوسرا متنبہ کرنے والا اس کو متنبہ کرے گا۔ آج بھی جب کسی کے سامنے خدا و رسول کا حکم بیان کیا جائے تو اس کو اپنی آواز اسی طرح پست کر لینا چاہیے جس طرح دورِ اول کے اہل ایمان نے اس کے مقابلہ میں اپنی آواز کو پست کر لیا تھا۔

دو گواہ

حاجی امداد اللہ صاحب (۱۸۹۹ - ۱۸۱۷) دیوبند کے بڑے بزرگوں میں سے تھے۔ ان کا طریقہ تھا کہ جب کوئی شخص کسی کے بارہ میں کوئی بری بات کہتا تو وہ فوراً کہتے کہ دو گواہ لے آؤ۔ اور جب وہ دو گواہ نہ لاتے تو بات کو وہیں ختم کر دیتے اور کہتے کہ جب تمہارے پاس اپنی بات کے حق میں دو گواہ نہیں ہیں تو تمہاری بات قابلِ اعتبار نہیں۔

یہ عین شرعی طریقہ ہے۔ اسلام میں معاملات کے اثبات کے لیے شہادت کا اصول رکھا گیا ہے۔ یعنی کوئی شخص کوئی معاملہ کرے یا کسی بات کا دعوی کرے تو وہ اپنے دعوے کے حق میں معتبر گواہ پیش کرے۔ زنا کے معاملہ میں چار گواہ کا اصول ہے، اور بقیہ تمام معاملات میں دو گواہ کا اصول۔

ایک شخص کسی کے اوپر کوئی الزام لگائے تو البیّنۃ علی المدّعی کے شرعی اصول کے مطابق، اس کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اس کا ثبوت پیش کرے۔ ضروری ثبوت پیش نہ کرنے کی صورت میں اس کی بات بالکل بے بنیاد قرار دی جائے گی۔

مگر موجودہ زمانہ میں مزاجوں کے بگاڑ کی وجہ سے یہ اصول عملاً ختم ہو گیا ہے۔ خاص طور پر جس شخص سے کسی وجہ سے شکایت یا تلخی ہو جائے اس کے بارہ میں تو کسی قسم کے ثبوت کی قطعاً ضرورت نہیں۔ جو بھی الٹی بات اس کے بارہ میں کہہ دی جائے اس کو سنتے ہی مان لیا جاتا ہے۔ نہ کوئی ثبوت مانگا جاتا اور نہ دو گواہ طلب کیے جاتے۔

یہ بیماری اتنی بڑھ گئی ہے کہ عوام تو درکنار خواص بھی اس میں ملوث ہیں۔ حتی کہ اکابر تک اس سے مستثنیٰ نہیں۔ کم از کم میں نے اپنی زندگی میں کسی کے بارہ میں نہیں سنا یا جانا کہ اس کے سامنے اس کے "مخالف" پر کوئی الزام لگایا جائے اور وہ الزام لگانے والے سے کہے کہ اپنی بات کے ثبوت میں دو گواہ لاؤ، ورنہ تمہاری بات قبول نہیں کی جائے گی۔

قدیم زمانہ میں بزرگی کا مطلب وہ تھا جس کی مثال اوپر کے واقعہ میں نظر آتی ہے۔ مگر آج بزرگی کا مفہوم بالکل بدل گیا ہے۔ آج ایک آدمی گواہ اور ثبوت کے بغیر ایک الٹی بات کو مان لیتا ہے، اس کے باوجود اس کی بزرگی میں کوئی فرق نہیں آتا۔ پھر بھی وہ اپنے معتقدین کے درمیان بدستور مقدس بنا رہتا ہے۔

تعلیم، تحریک

علی گڑھ کالج (موجودہ مسلم یونیورسٹی) کے ابتدائی زمانہ کا واقعہ ہے۔ ایک مسلمان نے اپنے لڑکے کو تعلیم کے لیے علی گڑھ بھیجا۔ روانگی سے قبل انھوں نے اپنے صاحبزادے کو جو ضروری ہدایات دیں، ان میں سے ایک ہدایت یہ تھی کہ "دیکھو، رائڈنگ کلب کے گھوڑے پر وضو کے بغیر سوار نہ ہونا۔"

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابتدائی زمانہ میں علی گڑھ کے بارہ میں مسلمانوں کے جذبات کیا تھے۔ وہ لڑکوں کو گھوڑے پر چڑھاتے ہوئے "بسم اللہ" اور "وضو" کی تاکید کرتے تھے۔ اس کے باوجود کیا وجہ ہے کہ علی گڑھ میں وہ مسلم نسل تیار نہ ہو سکی جو دور جدید کی شہسوار بن سکتی اور جدید چیلنج کا مقابلہ کرکے اسلام کو دوبارہ اس بلند مقام پر بٹھاتی جو دین فطرت ہونے کی حیثیت سے اس کے لیے ابدی طور پر مقدر کر دیا گیا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ اس قسم کے انسان تحریک سے پیدا ہوتے ہیں نہ کہ تعلیم سے۔ تعلیم گاہ میں صرف زبان اور علوم سکھائے جاتے ہیں۔ وہاں پروفیشنل سرٹیفکیٹ دیئے جاتے ہیں۔ اور ایک تعلیم گاہ کے ذریعہ صرف اتنا ہی ہو سکتا ہے۔ تعلیم گاہ آدمی کو واقف کار بنا سکتی ہے۔ وہ آدمی کو اس قابل بنا دیتی ہے کہ وہ لکھنے اور پڑھنے لگے۔ مگر فکری انقلاب اور مقصدی حرکت اس سے الگ ایک چیز ہے، اور وہ کسی تعلیم گاہ کے ذریعہ کبھی پیدا نہیں کی جا سکتی۔

خود علی گڑھ میں اس کی ایک عملی مثال موجود ہے۔ طلبہ کے سرپرستوں کی مذکورہ تمناؤں یا یونیورسٹی میں تھیالوجی کے شعبہ سے وہاں کے طلبہ میں کبھی دینداری نہ آسکی۔ مگر موجودہ زمانہ میں جب تبلیغی جماعت نے وہاں دعوتی اور تحریکی انداز میں محنت کی تو بہت سے طلبہ میں دینداری پیدا ہو گئی۔

ضرورت ہے کہ مسلم یونیورسٹی میں تعلیم کے ساتھ تحریک کا اضافہ کیا جائے۔ تحریک سے میری مراد طلبہ کی یونین نہیں ہے۔ وہ تو میرے نزدیک صرف بگاڑ پیدا کرنے کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ میری مراد ایک ایسی تحریک سے ہے جو مکمل طور پر غیر سیاسی انداز کی ہو اور وقت کے فکری معیار پر اسلامی دعوت کا کام کرے۔ یہی تحریکی عمل اس بات کا ضامن ہوگا کہ علی گڑھ میں صرف ڈگری ہولڈر پیدا نہ ہوں بلکہ وہاں سے وہ انقلابی انسان تیار ہو کر نکلیں جو اسلام کی نئی تاریخ بنا سکیں۔

ردّعمل کا نتیجہ

مسٹر جی ڈی برلا (۱۹۸۳-۱۸۹۴) ہندستان کے عظیم ترین صنعت کار ہونے کے علاوہ آزادی کی جدوجہد میں مہاتما گاندھی کے قریبی ساتھیوں میں سے تھے۔

مسٹر برلا کے اندر قومی آزادی کے خیالات کس طرح پیدا ہوئے، اس سلسلے میں وہ خود لکھتے ہیں کہ " جب میری عمر سولہ سال تھی، میں نے کلکتہ میں دلال (broker) کی حیثیت سے اپنا ایک آزاد کاروبار شروع کیا۔ اس طرح میرا ربط انگریزوں سے بڑھا جو کہ اس وقت میرے گاہک یا میرے افسر تھے۔ ان سے ربط کے دوران میں نے ان کے اعلیٰ تجارتی طریقے دیکھے۔ ان کی تنظیمی صلاحیت اور ان کی دوسری بہت سی خصوصیات کا تجربہ ہوا۔ مگر ان کا نسلی غرور میرے لیے ناقابل برداشت تھا۔ مجھے یہ اجازت نہیں تھی کہ میں ان کے آفس میں جانے کے لیے لفٹ استعمال کروں۔ نہ مجھے اجازت تھی کہ انتظار کے وقت ان کی بنچ پر بیٹھوں۔ یہ توھین (insult) میرے لیے بہت تکلیف دہ تھی۔ اس کے نتیجہ میں میرے اندر سیاست سے دلچسپی پیدا ہوئی جو ۱۹۱۲ سے لے کر آخر تک پوری طرح قائم رہی۔

ہندستان ٹائمس (۱۲ جون ۱۹۸۳) کے اڈیٹر نے اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ ان کی قوم پرستی کا آغاز تھا:

This was the beginning of his nationalism.

مسٹر برلا کا نیشنلزم نفرتِ انگریز کے نتیجہ میں پیدا ہوا۔ اسی طرح موجودہ زمانہ کے مسلم لیڈروں کا اسلام ازم بھی کسی نہ کسی دشمن یا حریف کے خلاف نفرت کے تحت پیدا ہوا۔ دونوں اگرچہ الگ الگ الفاظ بولتے تھے۔ مگر دونوں ہی ردعمل کی پیداوار تھے۔ مثبت کیس نہ ایک کا تھا اور نہ دوسرے کا۔

ایک ہے ایجابی محرک کے تحت اٹھنا۔ دوسرا ہے منفی محرک کے تحت اٹھنا۔ ایجابی محرک کے تحت اٹھنے کا نام عمل ہے اور منفی محرک کے تحت اٹھنے کا نام ردّعمل۔ کوئی حقیقی نتیجہ ہمیشہ حقیقی عمل کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔ ردّعمل کوئی حقیقی عمل ہی نہیں۔ اس لیے اس کا کوئی حقیقی نتیجہ بھی ظاہر ہونے والا نہیں۔

تعمیر کا طریقہ

سینے کی سوئی جو بازار میں بکتی ہے، وہ اچانک نہیں بن جاتی۔ بلکہ بہت سے مرحلوں سے گزر کر تیار ہوتی ہے۔ سوئی کے کارخانہ میں لوہے کے ایک ٹکڑے کو تقریباً ۲۰ مرحلوں سے گزرنا ہوتا ہے، تب وہ سوئی بن کر تیار ہوتی ہے جس کو ایک آدمی سلائی کے کام میں استعمال کر سکے۔ سوئی بنانے والا ابتدائی لوہے کا تار، کچے لوہے سے اسٹیل کا تار بننے تک جن مراحل سے گزرتا ہے وہ اس کے علاوہ ہے۔

یہ ایک سادہ چیز کی مثال ہے۔ اسی پر قیاس کیا جا سکتا ہے کہ دوسری مصنوعات اور پیچیدہ مشینوں کی تیاری میں کتنا زیادہ وقت لگتا ہوگا۔

مادہ کو مطلوبہ قالب میں ڈھالنے سے بہت زیادہ مشکل یہ کام ہے کہ انسان یا کسی انسانی گروہ کو مطلوبہ قالب میں ڈھالا جائے۔ مادہ اپنا ذاتی ارادہ نہیں رکھتا، مگر انسان کے اندر اپنا ذاتی ارادہ موجود ہے۔ اس لیے انسانی زندگی میں اصلاح کا کام بے حد مشکل ہو جاتا ہے۔

مگر موجودہ زمانہ کے مسلمان لیڈر اس حقیقت سے بالکل ناواقف ہیں۔ وہ اس طرح کام کرتے ہیں گویا ملت کی تعمیر کے معاملہ میں کوئی نتیجہ حاصل کرنے کے لیے کسی لمبے عمل کی ضرورت نہیں۔ یہاں محض نعروں اور تقریروں سے وہ شاندار نتائج حاصل ہو سکتے ہیں جو دوسرے معاملات میں صرف منصوبہ بند عمل ہی کے ذریعہ حاصل ہوتے ہیں۔

پچھلے سو برس کے اندر بے شمار سوئی کے کارخانے بنائے گیے، اور وہ کامیابی کے ساتھ چل رہے ہیں۔ مگر اسی مدت میں رہنماؤں کی دھواں دھار کوششوں کے باوجود ملت کی تعمیر ممکن نہ ہو سکی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سوئی کا کارخانہ بنانے کے لیے قدرت کے قانون کی پوری رعایت کی جاتی ہے۔ مگر ملت کا کارخانہ بنانے کے لیے قدرت کے قوانین کی رعایت نہیں کی جا سکی۔ ملت کے معاملہ میں شاید لوگوں کا خیال ہے کہ محض نعرہ اور تقریر کا کرشمہ دکھانے سے نتیجہ برآمد ہو جائے گا۔

ملت کی تعمیر کا کام جلسوں اور مظاہروں سے شروع نہیں کیا جا سکتا۔ ملت کی تعمیر کا کام اصلاً افراد کی تعمیر کا کام ہے۔ اور افراد کی تعمیر کا کام خاموش محنت کے بغیر انجام پانا ممکن نہیں۔ یہی عقل اور تاریخ کا فیصلہ ہے۔

بزدلی نہیں اخلاق

ایک صاحب نے کہا کہ میں آپ کا الرسالہ پڑھتا ہوں۔ مگر اس کی ایک بات مجھے پسند نہیں۔ آپ مسلمانوں کو ہمیشہ صبر کی تلقین کرتے ہیں۔ یہ تو بزدلی ہے۔ کیا آپ سارے مسلمانوں کو بزدل بنا دینا چاہتے ہیں۔

یہ صاحب ایک چھوٹے دکاندار ہیں۔ وہ عام ضرورت کی چیزیں بیچتے ہیں۔ ایک روز میں ان کی دکان پر گیا۔ میں وہاں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک لڑکا آیا۔ اس کے ہاتھ میں دیاسلائی تھی، اس نے دیاسلائی کی ڈبیہ زور سے ان کی طرف پھینکی اور بگڑ کر کہا: اس پر آپ ۶۰ تیلی لکھے ہوئے ہیں۔ حالاں کہ اس میں صرف ۵۰ تیلیاں ہیں۔ لڑکے نے گستاخی بھی کی تھی اور جارحیت بھی۔ مگر دکان دار نے اس کے خلاف کچھ نہیں کہا۔ بس خاموشی کے ساتھ دوسری ڈبیہ نکال کر اس کو دیدی۔ نرمی کے ساتھ صرف اتنا کہا: کوئی بات نہیں، دوسری لے جاؤ۔

لڑکا جب چلا گیا تو میں نے دکاندار سے پوچھا کہ لڑکے نے اتنی سخت بدتمیزی کی، مگر آپ کچھ نہیں بولے۔ دکاندار نے کہا کہ پہلے میں خوب بولتا تھا، بلکہ گاہکوں سے لڑائی کر لیتا تھا، مگر اس کے بعد کیا ہوا کہ میری دکانداری ختم ہو گئی۔ پھر میں نے ایک بنیا کو دیکھا کہ وہ کیا کرتا ہے، اس کی دکان خوب چل رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ وہ گاہکوں سے کبھی نہیں الجھتا۔ وہ گاہک کی ہر الٹی بات کو نظر انداز کر کے اس سے معاملہ کرتا ہے۔ میں بھی ایسا ہی کرنے لگا۔ اب خدا کے فضل سے میری دکان چلنے لگی۔ بلکہ پہلے سے بھی زیادہ اچھی چل رہی ہے۔

دکاندار کی بات میں خاموشی کے ساتھ سنتا رہا۔ آخر میں میں نے کہا: بھائی صاحب، مجھ میں اور آپ میں صرف ایک لفظ کا فرق ہے۔ آپ تجارتِ دنیا کے لیے بزدل بنے ہوئے ہیں، میں تجارتِ آخرت کے لیے بزدل بن جانا چاہتا ہوں۔

حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کا معاملہ "بزدلی" نہیں، وہ ایک اخلاقی اصول ہے۔ وہ بے عملی نہیں بلکہ عین عمل ہے۔ وہ ہار ماننا نہیں ہے بلکہ سب سے بڑی جیت کی طرف قدم بڑھانا ہے۔ وہ کھونا نہیں بلکہ پانا ہے۔ وہ کسی آدمی کے سامنے جھکنا نہیں ہے بلکہ رب العالمین کے سامنے اپنے آپ کو جھکانا ہے۔

جو لوگ صبر کی اہمیت کو نہیں سمجھتے، اس کا سبب صرف ان کی ناسمجھی اور کوتاہ بینی ہے نہ کہ ان کی معاملہ فہمی اور سمجھداری۔

زندگی کا سوال

گریٹا گاربو (Greta Garbo) ۱۸ ستمبر ۱۹۰۵ کو سویڈن میں پیدا ہوئی، ۱۵ اپریل ۱۹۹۰ کو امریکہ میں اس کا انتقال ہوا۔ اس کو شہرت اور دولت (fame and money) کی تمنا تھی۔ اس کے لیے وہ فلمی دنیا میں گئی۔ یہاں اس کو اتنی کامیابی ملی کہ وہ فلمی دیوی (screen goddess) کہی جانے لگی۔

فلم نے گریٹا گاربو کو دولت اور شہرت دی۔ مگر اس نے اس کی اپنی شخصیت کو اس سے چھین لیا۔ وہ پوری طرح فلم کمپنی کے کنٹرول میں تھی۔ ایسا بال کاٹو، ایسا کپڑا پہنو، اس طرح بولو، اس طرح چلو۔ اس کے چہرے کو میک اپ کے ذریعہ بار بار بدلا جاتا۔ اس کی مسلسل مالش کی جاتی تاکہ اس کی جسمانی نزاکت باقی رہے۔ وغیرہ۔ ان چیزوں سے وہ اتنا گھبرا اٹھی کہ اپنی تنہائیوں میں اکثر وہ روتی اور چیختی۔ مگر وہ فلمی ذمہ داروں کے ہاتھ میں بالکل بے بس تھی۔

آخر کار ۱۹۴۱ میں اس نے فلمی زندگی کو مکمل طور پر چھوڑ دیا۔ اس کے بعد سے آخر عمر تک اس نے اپنے گھر کے اندر بالکل تنہا زندگی گزاری، یہاں تک کہ ۸۴ سال کی عمر میں اس کا انتقال ہو گیا۔ شہرت کی زندگی گمنامی کی موت پر ختم ہو گئی۔

گریٹا گاربو گم نام مرجانا چاہتی تھی۔ اینٹونی گرونو ویز نے بمشکل اس کو تیار کیا کہ وہ اس کو اپنی زندگی کے حالات لکھنے کی اجازت دے اور اس کو اپنے حالات بتائے۔ گریٹا گاربو نے سخت اصرار کے بعد اس شرط پر اجازت دی کہ اس کے بارہ میں جو کتاب لکھی جائے وہ اس کے مرنے کے بعد چھپے۔ اس طرح ایک کتاب تیار ہوئی۔ مگر مصنف کا انتقال ۱۹۸۵ میں ۷۱ سال کی عمر میں ہو گیا جب کہ گریٹا گاربو ابھی زندہ تھی۔ گریٹا گاربو کے مرنے کے بعد ۱۹۹۰ میں یہ کتاب امریکہ سے شائع کی گئی ہے۔ اس کا نام یہ ہے:

Garbo: Her Story by Antoni Gronowicz

ٹائمس آف انڈیا (۹ ستمبر ۱۹۹۰) میں اس کتاب کا ایک حصہ شائع ہوا ہے۔ اس کے مطابق گریٹا گاربو نے اپنی آخر عمر میں مصنف سے کہا:

I have lost a belief in people, in a God who put me in this situation without replying clearly to my questions. I am floating on the waters of life without direction, without a goal, without the knowledge of why and how long. (p. 15)

میں نے عوام میں اپنا یقین کھو دیا ہے۔ میں نے خدا میں بھی یقین کھو دیا ہے جس نے مجھے اس حال میں رکھا، بغیر اس کے کہ وہ میرے سوالات کا واضح جواب دے۔ میں زندگی کے پانی میں کسی سمت کے بغیر بہہ رہی ہوں۔ میری کوئی منزل نہیں۔ مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ کیوں اور کب تک میرا یہ سفر جاری رہے گا۔

یہ ایک ایسی عورت کی کہانی ہے جس نے خدا کو چھوڑ کر غیر خدا کو اپنا مرکز توجہ بنایا، پھر اس کو اس میں تسکین نہ مل سکی۔ یہاں تک پچاس سال بے چینی کی حالت میں رہ کر اس نے اپنی جان دیدی۔

گریٹا گاربو کا واقعہ ایک انتہائی انداز کا واقعہ ہے۔ مگر کم و بیش یہی واقعہ ہر ایک کے ساتھ پیش آرہا ہے۔ ہر آدمی خدا کو چھوڑے ہوئے ہے۔ ہر آدمی کسی نہ کسی غیر خدا کو حاصل کرنے کے لیے دوڑ رہا ہے۔ مگر جب وہ اس کو پالیتا ہے تو اس کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کی طلب کا جواب نہ تھا۔ اس نے غلط فہمی میں ایک ایسی چیز کو اپنا مقصود و مطلوب بنالیا جو حقیقۃً اس کا مقصود و مطلوب نہ تھا۔

ہر آدمی اس حوصلہ کے ساتھ اپنی زندگی کا سفر شروع کرتا ہے کہ وہ اپنی منزل کی طرف تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ مگر جب منزل آتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ منزل نہ تھی بلکہ ایک کھڈ تھا جس میں وہ اپنی تمام آرزوؤں اور تمناؤں کو لیے ہوئے جا گرا۔

سائنس کی واپسی

ایک درخت جس کی جڑ کٹی ہوئی ہو، اس کو زمین میں لگائیں تو پہلے دن وہ بظاہر ہرا بھرا دکھائی دے گا۔ مگر اگلے ہی دن اس کی پتیاں مرجھانا شروع ہو جائیں گی۔ یہاں تک کہ وہ سوکھ کر ختم ہو جائے گا۔ یہی حال موجودہ زمانہ میں الحاد اور انکار مذہب کا ہوا ہے۔ ابتدا میں ایسا معلوم ہوتا تھا گویا مذہب کا دور ختم ہوگیا، اور اب انسانی تاریخ ہمیشہ کے لیے لامذہبیت کے دور میں داخل ہوگئی ہے۔ مگر جلد ہی یہ تمام خیالات بکھر گیے۔ مذہب نئی طاقت کے ساتھ دوبارہ انسانی زندگی میں لوٹ آیا۔

انیسویں صدی کے آخر تک علمی دنیا میں اس چیز کا زور تھا جس کو پرجوش طور پر علمی الحاد (Scientific atheism) کہا جاتا ہے۔ مگر بیسویں صدی میں سائنس میں جو نئی تحقیقات ہوئیں، انھوں نے علمی الحاد کو بے زمین کرنا شروع کر دیا۔

بیسویں صدی کے آغاز میں سر جیمز جینز نے اعلان کیا تھا کہ جدید سائنس نے جو کائنات دریافت کی ہے، وہ مشینی توجیہہ (Mechanical interpretation) کو قبول کرنے سے انکار کر رہی ہے۔ اب اس صدی کے آخر میں نظریاتی طبیعیات والوں (Theoretical physicists)[1] کی بڑی تعداد ایسی پیدا ہوگئی ہے جو کائنات کی تشریح ایسے انداز میں کر رہی ہے جس کے مطابق، خدا کو مانے بغیر کائنات کی توجیہہ ممکن نہیں۔

اس سلسلہ میں ۱۹۸۸ میں ایک قابل ذکر کتاب چھپی ہے۔ یہ ۲۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ کتاب کا نام اور مصنف کا نام حسب ذیل ہے:

Stephen W. Hawking, *A Brief History of Time*

بگ بینگ (Big bang) نظریہ کہتا ہے کہ کائنات اپنے آغاز سے اب تک ایک خاص رفتار سے مسلسل پھیل رہی ہے۔ اس سلسلہ میں اسٹیفن ہاکنگ نے حساب لگا کر بتایا ہے کہ کائنات کے پھیلنے کا یہ عمل نہایت سوچا سمجھا (Well-calculated) ہے۔

رفتار توسیع کی ابتدائی شرح حد درجہ صحت کے ساتھ مقرر کی گئی ہے۔ کیوں کہ رفتار توسیع کی یہ شرح اس نازک شرح (Critical rate) کے انتہائی قریب ہے جو کائنات کو دوبارہ انہدام (Recollapse)

سے بچانے کے لیے ضروری ہے ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر گرم بگ بینگ کا ماڈل درست ہے اور اسی سے وقت کا آغاز ہوا ہے تو کائنات کی ابتدائی حالت حد درجہ احتیاط کے ساتھ منتخب کی گئی ہو گی ۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اب تک کائنات پھٹ کر ختم ہو چکی ہوتی ۔

اس مظہر کی کوئی توجیہہ نہیں کی جا سکتی جب تک یہ نہ مانا جائے کہ کائنات کی توسیع کی شرحِ رفتار (Rate of expansion) حد درجہ احتیاط کے ساتھ منتخب کی گئی ہے ۔

اسٹیفن ہاکنگ نے اس قسم کی تفصیلات بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ کائنات کیوں ٹھیک اس انداز پر شروع ہوئی ، اس کا جواب دینا انتہائی مشکل ہو گا سوا اس کے کہ یہ مانا جائے کہ یہ خدا کا عمل ہے جس نے چاہا کہ وہ ہمارے جیسی مخلوق کو یہاں پیدا کرے :

It would be very difficult to explain why the universe should have begun in just this way, except as the act of a God who intended to create beings like us (p. 134).

کائنات کی ایک حیرت ناک صفت یہ ہے کہ وہ خدائی تعبیر کے سوا کسی اور تعبیر کو قبول نہیں کرتی ۔ کائنات ایک معلوم اور مشہود واقعہ ہے ۔ اس کے وجود سے انکار ممکن نہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ ہر زمانہ میں بہترین دماغ اس کی تشریح و تعبیر میں مصروف رہے ہیں ۔

کسی نے کہا کہ کائنات ہمیشہ سے اسی طرح ہے ۔ کسی نے کہا کہ وہ اپنے آپ بنی اور اپنے آپ چلی جا رہی ہے ۔ کسی نے کہا کہ اسباب و علل کا ایک سلسلہ ہے جس نے کائنات کی تمام چیزوں کو وجود دیا ہے ۔ کسی نے اصول ارتقاء کو کائنات کا خالق ثابت کرنے کی کوشش کی ۔ وغیرہ

مگر خود انسانی معلومات ان تمام تشریحات و توجیہات کو رد کرتی رہیں ۔ کائنات کے نظام کے بارہ میں انسان جتنا زیادہ واقفیت حاصل کرتا ہے ۔ اتنا ہی زیادہ یہ بات بے معنی معلوم ہوتی ہے کہ اس کائنات کا خالق و مالک ایک خدائے ذوالجلال کے سوا کوئی اور ہو ۔

کائنات اپنے وجود کے ساتھ یہ گواہی دیتی ہے کہ اس کا خالق خدا ہے ۔ خدا کے سوا کسی اور کو خالق کائنات بتانا صرف ایک بے بنیاد دعویٰ ہے ۔ جس کے حق میں کوئی حقیقی ثبوت موجود نہیں ۔ اس سلسلہ میں جتنے دعوے یا مخالفانہ نظریے پیش کیے گیے ، وہ خود علم انسانی کی روشنی میں غلط اور بے بنیاد ثابت ہو گئے ۔

غلط فہمی

کویت پر عراقی قبضہ کے بعد کویت کا حکمراں خاندان سعودی عرب چلا گیا تھا۔ دوبارہ جب کویت عراقی قبضہ سے آزاد ہوا تو کویت کے ولی عہد سعد الصباح ۴ مارچ ۱۹۹۱ کو اپنے وطن واپس آئے۔ کویت ایئر پورٹ پر وہ اپنے ہوائی جہاز سے اترے تو ایک واقعہ ہوا۔ ایسوسی ایٹڈ پریس کے فوٹو گرافر نے فوراً اس کا فوٹو لے لیا۔ یہ فوٹو ٹائمس آف انڈیا، اور ہندستان ٹائمس (۶ مارچ ۱۹۹۱) کے صفحہ اول پر شائع ہوا ہے۔ مقابل کے صفحہ پر ہم اس کو نقل کر رہے ہیں۔

اس تصویر کے نیچے جو تشریحی الفاظ چھاپے گئے ہیں وہ یہ ہیں: "کویت کے ولی عہد سعد الصباح خلیج کی جنگ کے بعد ۴ مارچ کو جلاوطنی سے واپس آئے۔ ہوائی جہاز سے اترنے کے بعد کویت ایئر پورٹ پر وہ اپنے وطن کی زمین کو چوم رہے ہیں"۔ امریکی نیوز ایجنسی کے نمائندہ نے دیکھا کہ سعد الصباح سات مہینہ کے بعد اپنے وطن واپس آئے تو ہوائی جہاز سے باہر آنے کے بعد انھوں نے اپنی پیشانی زمین پر رکھ دی۔ اس نے اپنے ذہن کے تحت سمجھا کہ بچھڑے ہوئے وطن کو دوبارہ پاکر وہ اس کی زمین کو چوم رہے ہیں۔ حالاں کہ اصل واقعہ یہ تھا کہ انھیں اللہ کا انعام یاد آیا اور وہ سجدۂ شکر کے طور پر زمین پر گر پڑے۔ سعد الصباح کے لئے وہ اللہ کے سامنے مومنانہ سجدہ تھا، مگر غیر مسلم اخبار نویس کے ذہن میں وہ زمین کا سجدہ بن گیا۔

انسانوں کے درمیان اکثر غلط فہمیاں اسی طرح پیدا ہوتی ہیں۔ غلط فہمی حقیقۃً غلط توجیہ کا دوسرا نام ہے۔ آدمی دوسرے کے بارہ میں ایک بات سنتا ہے یا دوسرے کے کسی واقعہ کو دیکھتا ہے۔ اور پھر اپنے ذاتی ذہن کے مطابق بطور خود اس کو ایک معنی پہنا دیتا ہے۔

ایسے موقع پر صحیح طریقہ یہ ہے کہ آدمی نے جو کچھ دیکھا یا سنا ہے، اس کے بارہ میں وہ مزید تحقیق کر کے پوری بات معلوم کرے۔ اور پھر پوری معلومات کی روشنی میں کوئی رائے قائم کرے۔ مگر آدمی ایسا نہیں کرتا۔ وہ پیش آمدہ معاملہ کے بارہ میں غیر ذمہ دارانہ طور پر ایک رائے قائم کر لیتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بھیانک غلطی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ وہ "سجدۂ الٰہی" کو "سجدۂ زمین" سمجھ لیتا ہے۔ وہ ایک موحدانہ واقعہ کو مشرکانہ واقعہ بنا دیتا ہے۔

ایسا اگر جان بوجھ کر کیا جائے تو وہ بہتان ہے جو اللہ کے نزدیک بہت بڑا جرم ہے۔ تاہم اگر حقیقت حال آدمی کے علم میں نہ ہو تب بھی وہ یقینی طور پر قصور وار ہے۔ کیوں کہ شریعت میں اس قسم کی بات کی تحقیق کا لازمی حکم دیا گیا ہے۔ ایسے کسی معاملہ میں آدمی اگر اپنی زبان کھولنا چاہتا ہے تو اس پر لازم ہے کہ وہ پہلے اس کی ضروری تحقیق کرے۔ اور اگر وہ کسی وجہ سے تحقیق نہیں کر سکتا ہے تو اس کو چاہئے کہ وہ اس معاملہ میں چپ رہے، نہ کہ ناکافی معلومات کو لے کر اس پر بولنے لگے۔



Crown Prince Saad al-Sabah of Kuwait kisses the ground after alighting from the plane at Kuwait City international airport on Monday as he returned from exile following the war. — AP/PTI

اتحاد کی طاقت

ٹائیکوبراہے (Tycho Brahe) ۱۵۴۶ میں پیدا ہوا، اور ۱۶۰۱ میں پراگ میں اس کی وفات ہوئی۔ جوہانس کپلر (Johannes Kepler) ۱۵۷۱ میں پیدا ہوا، اور ورٹمبرگ میں ۱۶۳۰ میں اس کی وفات ہوئی۔ دونوں فلکیات کے شعبہ میں تحقیق کر رہے تھے، مگر دونوں میں سے کوئی بھی اس حیثیت میں نہ تھا کہ وہ عالم افلاک میں کوئی بڑی حقیقت دریافت کر سکے۔

ٹائیکو براہے اور کپلر دونوں ہم عصر تھے۔ مگر ایک چیز دونوں کے لئے کسی بڑی فلکیاتی دریافت میں رکاوٹ بنی ہوئی تھی۔ وہ یہ کہ دونوں میں سے کوئی بھی اپنے موضوع کے ہر گوشہ پر مہارت نہ رکھتا تھا۔ ٹائیکو براہے نے کثرت سے فلکیات کا مشاہدہ کیا تھا۔ وہ اپنے مشاہدات کو قلم بند کرتا رہتا تھا، فلکیاتی مشاہدات کے بارہ میں یہ تحریری ذخیرہ اس کے پاس کافی مقدار میں جمع ہو گیا تھا۔ مگر علم الافلاک کا دوسرا پہلو ریاضی سے تعلق رکھتا ہے، اور ٹائیکو براہے ریاضی میں کمزور تھا۔ اس بنا پر اس کو یہ قدرت حاصل نہ تھی کہ اپنے مشاہدات کو ریاضی کی کلیات میں مربوط کر سکے۔

دوسری طرف کپلر کا معاملہ یہ تھا کہ وہ فلکیاتی مشاہدہ میں کوئی مہارت نہ رکھتا تھا۔ وہ بہت کم مشاہدہ کرتا تھا۔ اس کے زمانہ میں اگرچہ دوربین دریافت ہو چکی تھی، مگر عملاً وہ دوربین سے کام نہ لے سکا تھا۔ اس کی خصوصیت صرف یہ تھی کہ وہ ریاضیات کا ماہر تھا اور حسابی طور پر اس نے فلکیات کے بارہ میں بہت سے قیمتی نظریات وضع کئے تھے۔

یہاں ٹائیکو براہے کی فراخ دلی نے کام کیا۔ ٹائیکو براہے اور کپلر میں اگرچہ ذاتی اختلافات تھے۔ حتی کہ کپلر نے اپنے ایک خط میں ٹائیکو براہے پر منافقت کا الزام لگایا تھا اور اس کو بہت برا بھلا کہا تھا، مگر ٹائیکو براہے، اپنی تیز مزاجی کے باوجود، کپلر پر غصہ نہیں ہوا۔ آخر وقت میں اس نے سوچا کہ میرے علمی ذخیرہ کا سب سے بہتر وارث کپلر ہی ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اس نے کپلر کی گستاخیوں کو بھلاتے ہوئے اس کو اپنے پاس بلایا اور ۱۶۰۱ میں

اپنی موت سے پہلے اپنا پورا تحریری ذخیرہ بلا معاوضہ کپلر کے حوالہ کردیا۔

جب ٹائیکو براہے کے مشاہدات کا سارا سرمایہ کپلر کے پاس آگیا تو کپلر کی کمی کی تلافی ہوگئی۔ اب اس نے اپنے دماغ کی تمام ریاضیاتی قوت کو ان مشاہدات کے ساتھ مربوط کرنے میں لگا دیا۔ اس کا نتیجہ ان تین کلیات کی صورت میں نکلا جو کپلر کے سہ گانہ قوانین حرکت Kepler's laws of planetary motion) کے نام سے مشہور ہیں۔ ان قوانین کو استعمال کرتے ہوئے بعد کو سر آئزک نیوٹن (۱۷۲۷ - ۱۶۴۳) نے قوت کشش (Gravitational force) کے بارہ میں اپنی دریافت مکمل کی۔

یہی موجودہ دنیا میں کسی بڑی کامیابی کا راز ہے۔ ہر آدمی کی اپنی محدودیت ہوتی ہے۔ اس بنا پر کوئی بھی شخص تنہا کوئی بڑا کام نہیں کرسکتا۔ کوئی بڑا کام اس وقت انجام پاتا ہے جب کہ کئی لوگ اپنی صلاحیتوں اور اپنی کوششوں کو ایک رخ پر لگانے کے لئے راضی ہوجائیں۔ متحدہ کوشش کے بغیر اس دنیا میں کسی بڑے واقعہ کو ظہور میں لانا ممکن نہیں۔

مگر متحدہ کوشش کی ایک قیمت ہے۔ اور وہ قیمت ہے —— اختلاف کی باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اتحاد کی بات پر ایک دوسرے سے جڑنا۔ اختلاف کے باوجود لوگوں کے ساتھ متحد ہوجانا۔

انسان کے اندر اختلاف کا پایا جانا لازمی ہے۔ اس دنیا میں اخلاص کے باوجود لوگوں کے درمیان اختلاف پیدا ہوجاتا ہے۔ اختلاف سے بچنا کسی طرح ممکن نہیں۔ ایسی حالت میں عملی بات صرف یہ ہے کہ لوگ اختلاف کے باوجود متحد ہونے کا حوصلہ پیدا کریں۔ اجتماعی مفاد کے لئے انفرادی پہلوؤں کو بھلا دیں۔ بڑی چیز کی خاطر چھوٹی چیزوں کو نظر انداز کردیں۔ مقصد کے تقاضے کے لئے اپنی ذات کے تقاضوں کو دفن کردیں۔

اسی کا نام بلند حوصلگی اور اعلیٰ ظرفی ہے۔ اور اس بلند حوصلگی اور اعلیٰ ظرفی کے بغیر اس دنیا میں کسی بڑے منصوبہ کو تکمیل تک پہنچانا ممکن نہیں۔

قومی مسئلہ

دسمبر ۱۹۹۰ میں میں امریکہ اور جاپان کے سفر پر تھا۔ تین ہفتہ کے اس سفر کے دوران میری ملاقات کویت کے ایک باشندہ سے ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ وہ کویت میں نہایت آرام کی زندگی گزار رہے تھے۔ ۲ اگست ۱۹۹۰ کو جب عراقی صدر صدام حسین نے دو لاکھ مسلح فوج کویت میں داخل کر دی اور اس پر قبضہ کر لیا تو اچانک انھوں نے پایا کہ ان کی جان، مال، عزت، سب کچھ غیر محفوظ ہے۔ وہ اپنا سب کچھ چھوڑ کر کویت سے بھاگے۔ طرح طرح کی مصیبتوں کا سامنا کرتے ہوئے وہ باہر کے ایک ملک میں پہنچ گئے، جہاں انھیں پناہ گزیں کی حیثیت سے قیام کرنا پڑا۔

گفتگو کے دوران مذکورہ کویتی مسلمان نے کہا کہ آپ لوگ انڈیا میں ہم سے بہت بہتر ہیں۔ آپ ایک بڑے ملک کے شہری ہیں۔ آپ کے ساتھ یہ حادثہ پیش نہیں آسکتا کہ کسی بیرونی ملک کی فوجیں اچانک آپ کے ملک میں گھس آئیں اور آپ کے اوپر زبردستی قبضہ کر لیں۔ جب کہ کویت ایک بہت چھوٹا ملک ہے۔ وہ کسی بھی وقت دوسروں کی دستبرد سے محفوظ نہیں۔

انھوں نے مزید کہا کہ دیکھئے۔ اسی صدام حسین نے اس سے پہلے ایران پر حملہ کیا اور آٹھ سال (۱۹۸۰-۱۹۸۸) تک اس سے لڑتا رہا۔ مگر وہ ایران کا کچھ بگاڑ نہ سکا۔ کیوں کہ ایران ایک بڑا ملک تھا۔ اور اب اسی صدام حسین نے صرف ایک دن کے اندر پورے کویت پر قبضہ کر لیا۔ کیوں کہ کویت ایک چھوٹا ملک ہے۔

مسئلہ کیا ہے

مجھے کویت کے باشندہ کی یہ بات بہت درست معلوم ہوئی۔ پھر میں نے سوچا کہ جب ایسا ہے تو انڈیا کے سرحدی صوبوں ——— پنجاب، کشمیر، آسام، میں علیحدگی کی تحریکیں کیوں چل رہی ہیں۔ حالانکہ یہ صوبے اگر انڈیا سے الگ ہو جائیں تو وہ کویت سے بھی زیادہ کمزور اور بے سہارا ہوں گے۔ ایسی حالت میں علیحدگی کے پر شور مطالبہ کا کیا حاصل۔ جن لوگوں کو ایک بڑے ملک کا شہری ہونے کا درجہ حاصل ہے، وہ اپنے کو چھوٹے ملک کا شہری بنانے پر کیوں تلے ہوئے ہیں۔

اس سوال پر غور کرتے ہوئے میری سمجھ میں آیا کہ اس نادانی کا اصل سبب وہ چیز ہے جس کو مذہب

میں عدم قناعت کہا گیا ہے۔ یعنی ملی ہوئی چیز کو کم سمجھنا ، اور جو چیز نہیں ملی اس کو زیادہ خیال کرنا۔

آسام اور پنجاب اور کشمیر والوں کو آج بھی بہت کچھ ملا ہوا ہے۔ مگر وہ اس پر قانع نہیں۔ وہ دیکھتے ہیں کہ کچھ لوگوں کو بعض اعتبار سے ان سے زیادہ حاصل ہے۔ وہ نہ ملے ہوئے پر نظر جمانے کی وجہ سے ملے ہوئے کی قدر نہیں کر پاتے۔ وہ نہ ملے ہوئے کو لینے کی فکر میں اپنے ملے ہوئے کو بھی برباد کر رہے ہیں۔

شیخ محمد عبد اللہ یہ سوچتے تھے کہ انڈیا سے الحاق شدہ کشمیر میں وہ صرف "چیف منسٹر" بن سکتے ہیں۔ اور اگر کشمیر ایک علیحدہ ملک کی حیثیت حاصل کر لے تو وہ اس کے "پرائم منسٹر" کہے جائیں گے۔ اس تخیل نے ان کے اندر آزاد کشمیر کا نظریہ پیدا کیا۔ یہی نظریہ ہے جس نے دوبارہ زندہ ہو کر کشمیر میں موجودہ خوں ریز تحریک کی صورت اختیار کر لی ہے۔

اسی قسم کے سنہرے خواب ہیں جو کشمیر، پنجاب، آسام، ہر جگہ کے لیڈروں کو علیحدگی کی تحریک پر اکسائے ہوئے ہیں۔ مگر یہ صرف خام خیالی ہے۔ اگر بالفرض یہ علاقے انڈیا سے الگ ہو جائیں اور وہاں کے لیڈر اپنے چھوٹے چھوٹے ملکوں کے پرائم منسٹر بن جائیں تو مسئلہ ختم نہیں ہو جائے گا بلکہ وہ شدید تر صورت اختیار کر لے گا۔ کیوں کہ ان کے مفروضہ آزاد ملک میں بھی پرائم منسٹر صرف ایک ہی شخص بنے گا۔ بقیہ تمام لوگ بدستور غیر پرائم منسٹر بن کر رہنے پر مجبور ہوں گے۔ اس کے نتیجہ میں دوبارہ نئی صورت میں مفادات کا ٹکراؤ شروع ہو جائے گا۔

اس کے بعد یہ ہوگا کہ آج جو "ٹکراؤ" صوبہ اور مرکز" کے درمیان ہے، وہ خود صوبہ (آزاد ملک) کے ایک گروہ اور دوسرے گروہ کے درمیان شدید تر شکل میں پیدا ہو جائے گا۔ اس کے نتیجے میں طرح طرح کی خرابیاں جنم لیں گی۔ "آزاد ملک" ترقی کی طرف سفر کرنے کے بجائے آپس کی لڑائیوں اور بے شمار نئے نئے مسائل کے درمیان پھنس کر رہ جائے گا۔ جس کی ایک قریبی مثال آج بھی بنگلہ دیش کی صورت میں دیکھی جاسکتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ سیاست کو نتیجہ رخی (result–oriented) ہونا چاہئے، سیاست کا صحیح ترین اصول یہ ہے کہ جو چیز حاصل ہونے والی نہیں اس میں مشغول ہو کر اپنی قوت کو ضائع نہ کرو، بلکہ حاصل ہونے والی چیز میں اپنی محنت کو لگاؤ۔ کیوں کہ سیاست دراصل ممکن کا

کھیل ہے:

Politics is the art of possible

اس دنیا میں تمام امنگوں کا پورا ہونا ممکن نہیں۔ یہاں آدمی کو امنگوں سے کم تر حالت پر راضی ہونا پڑتا ہے۔ عقل مند آدمی وہ ہے جو کم پر راضی ہو جائے۔ کم پر راضی ہو کر وہ ممکن کو پالیتا ہے۔ اور کم پر راضی نہ ہو کر وہ ممکن کو بھی کھو دیتا ہے۔ اور ناممکن تو پہلے ہی سے اس کے لئے کھویا ہوا ہے۔

ایک اور مثال

اسی طرح ایک اور سفر میں میری ملاقات بنگلہ دیش کے ایک مسلمان سے ہوئی۔ وہ کراچی جارہے تھے تاکہ وہاں اپنے لئے کوئی معاشی کام تلاش کریں۔ میں نے کہا کہ آپ لوگوں نے پاکستان سے لڑکر اپنا ملک الگ بنایا تھا۔ اور اس کو آپ لوگ "سونار بنگلہ" کہتے تھے۔ پھر اب پاکستان میں کیوں آپ اپنا مستقبل بنانا چاہتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ وہ سب لیڈروں کے نعرے تھے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ بنگلہ دیش بننے سے پہلے ہم لوگ آج سے بہت زیادہ بہتر تھے۔

اس معاملہ پر غور کیجئے تو زندگی کی ایک اہم حقیقت سامنے آتی ہے۔ آزاد بنگلہ دیش کی تحریک کیوں چلی اور ۱۹۷۱ میں بنگلہ دیش پاکستان سے الگ کیوں ہوا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ ۱۹۴۷ میں جب تقسیم ہوئی اور مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان کی صورت میں ایک علیٰحدہ ملک بنا تو اس وقت پنجابی لوگ فوج اور دوسرے سرکاری عہدوں پر چھائے ہوئے تھے۔ یہ صورت حال پاکستان بننے کے بعد بھی برقرار رہی۔ اس سے بنگلہ دیش والوں میں ناراضگی پیدا ہوئی۔ انھوں نے سمجھا کہ ہم انگریزوں کی غلامی سے نکل کر پنجابیوں کی غلامی میں آگئے ہیں۔ چنانچہ وہاں دوبارہ آزادی کی نئی تحریک چل پڑی۔

مگر یہ تحریک محض ایک جذباتی تحریک تھی۔ اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہ تھا۔ بنگلہ دیش کے لوگوں کے پچھڑے پن کا سبب ان کا تعلیمی پچھڑا پن تھا۔ یہ دوسروں کی غلامی کا مسئلہ نہ تھا بلکہ خود اپنی کمی اور کوتاہی کا مسئلہ تھا۔ اس کا صحیح حل یہ تھا کہ وہ پاکستان میں شریک رہتے ہوئے اپنی تعلیمی کمی کو دور کرنے کے لئے محنت کرتے۔ مگر بنگلہ دیش کے سطحی لیڈروں نے ان کی اس بے چینی کا سیاسی استحصال کیا۔ اور اپنی کمزوریوں کا الزام پاکستان پر ڈال کر نفرت کی ایک دھواں دھار تحریک چلادی۔ اس

کے نتیجہ میں بنگلہ دیش نے سیاسی آزادی تو حاصل کر لی۔ مگر اس سیاسی آزادی کے بعد جو ملک بنا وہ صرف ایک کمزور اور بدحال ملک تھا۔ عالمی نقشہ میں اس کی کوئی قیمت نہ تھی۔ جب اصل سبب دور نہ کیا گیا ہو تو انقلاب صرف ایک نئی بربادی کے ہم معنی ثابت ہوتا ہے۔

اس وقت پنجاب، آسام، اور کشمیر میں علیٰحدگی پسندی کی جو تحریکیں چل رہی ہیں، ان سب کی مشترک غلطی یہی ہے۔ ان صوبوں کے لوگوں کو کچھ شکایتیں ہیں۔ یہ شکایتیں بالفرض درست ہوں، تب بھی ان کے اسباب کچھ اور ہیں۔ مگر ان صوبوں کے لیڈروں نے ساری ذمہ داری "نئی دہلی" پر ڈال کر علیٰحدگی کی تحریک چلا دی۔ اگر بالفرض یہ تحریکیں کامیاب ہو جائیں اور انھیں ان کی مطلوبہ آزادی مل جائے تو یہ ان کے لئے موجودہ صورت حال سے بھی زیادہ برا ہوگا۔ وہ ایک کمزور اور بدحال ملک کی حیثیت سے زندہ رہیں گے۔ وہ صرف نیا بنگلہ دیش بنائیں گے، اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔

اس دنیا میں جب بھی کسی شخص یا گروہ کو کوئی محرومی پیش آتی ہے تو وہ خود اپنی کسی کمی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ آدمی کو چاہئے کہ وہ دوسروں سے لڑنے کے بجائے خود اپنی کمی کو دور کرے۔ اگر اس نے اپنی داخلی کمی کو دور کر لیا تو اس کی خارجی کمی اپنے آپ ختم ہو جائے گی۔

اصل حقیقت

اصل یہ ہے کہ موجودہ دنیا کامپٹیشن کی دنیا ہے۔ یہاں ہر وقت مقابلہ جاری رہتا ہے۔ اس مقابلہ میں ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ کوئی آگے بڑھ جاتا ہے اور کوئی پیچھے رہ جاتا ہے۔ کوئی زیادہ پر قابض ہو جاتا ہے اور کسی کو کم پر راضی ہونا پڑتا ہے۔

مگر اس قسم کی کوئی بھی صورت حال مستقل نہیں۔ یہاں ہر پچھڑے ہوئے کے لئے موقع ہے کہ وہ از سر نو محنت کرکے آگے بڑھ جائے۔ اور ہر آگے جانے والے کے لئے اندیشہ ہے کہ وہ نئے چیلنج کا مقابلہ کرنے میں کمزور ثابت ہو اور دوبارہ پچھلی صف میں پہنچ جائے۔

ایسی حالت میں زندگی کا اصل راز محنت ہے نہ کہ ٹکراؤ۔ بنگلہ دیش والوں نے تعلیم اور معاشی سرگرمیوں میں محنت کی ہوتی تو ایک روز آتا جب وہ پنجابیوں سے بھی آگے بڑھ جاتے۔ مگر منفی سیاست چلا کر وہ کچھ اور زیادہ برباد ہو گئے۔ اسی طرح پنجاب اور آسام اور کشمیر کے لوگ اگر تعلیم اور اقتصادیات جیسے تعمیری میدانوں میں محنت کریں تو وہ سارے ملک میں اونچا

مقام حاصل کر سکتے ہیں۔ مگر موجودہ منفی تحریک کے ذریعہ وہ صرف اپنے مواقع کو ضائع کر رہے ہیں۔ وہ اپنے دور تحریک میں بھی برباد ہو رہے ہیں۔ اور اگر وہ اپنے خیال کے مطابق کامیابی کے مرحلہ میں پہنچ جائیں تو ایک کمزور اور تباہ شدہ ملک کے سوا ان کے حصہ میں کچھ اور آنے والا نہیں۔

"سونار بنگلہ" اس دنیا میں محنت کے ذریعہ بنتا ہے، وہ سیاسی تحریک چلا کر یا مار دھاڑ کے ہنگامے جاری کر کے نہیں بنتا۔ ہمارے پنجابی اور کشمیری اور آسامی بھائیوں کے لئے بہترین نمونہ وہ ہے جو جاپان کی جدید تاریخ میں ملتا ہے۔

دوسری عالمی جنگ کے بعد جاپان نے امریکہ کی "محکومی" پر راضی رہتے ہوئے محنت کے میدان میں عمل کیا۔ امریکہ سے ٹکراؤ کے میدان کو چھوڑ کر وہ اس میدان میں سرگرم ہوا جہاں ٹکراؤ کا کوئی امکان نہ تھا۔ یہ طریق کار انتہائی مفید ثابت ہوا۔ ۴۵ سال بعد آج جاپان اتنی زیادہ ترقی حاصل کر چکا ہے کہ وہ خود امریکہ کو چیلنج کر رہا ہے۔

مگر ہمارے یہ بھائی بدقسمتی سے "بنگلہ دیش" کو اپنے لئے نمونہ بنائے ہوئے ہیں۔ حالاں کہ بنگلہ دیش کی حالت یہ ہے کہ اس نے خونیں جنگ لڑ کر ۱۹۷۱ میں نام نہاد سیاسی آزادی تو حاصل کر لی۔ مگر اس کے سوا ہر دوسری چیز کو اس نے کھو دیا۔ اور اس نے جو چیز کھوئی وہ اس سے بہت زیادہ قیمتی تھی جس کو اس نے زبردست قربانی کے بعد حاصل کیا تھا۔

انڈیا کے علیحدگی پسند لیڈروں کا نعرہ یہ ہے کہ "پہلے سیاسی آزادی حاصل کرو، اس کے بعد اقتصادی آزادی حاصل کرو"۔ اس کے بجائے ان کے لئے صحیح بات یہ تھی کہ وہ کہتے کہ "پہلے اقتصادی ترقی حاصل کرو، اس کے بعد سیاسی حقوق اپنے آپ حاصل ہو جائیں گے"۔

"پہلے پھل لے لو، اس کے بعد درخت لگا لینا" ایک بے معنی جملہ ہے۔ اسی طرح یہ تصور بھی بے معنی ہے کہ پہلے سیاسی انقلاب برپا کر لو، اس کے بعد اقتصادی انقلاب برپا کرنا۔ یہ قدرت کی اسکیم کا معاملہ ہے، اور قدرت نے اپنی اسکیم میں چیزوں کی جو ترتیب قائم کر دی ہے، اس میں تبدیلی لانا ہمارے لئے ممکن نہیں۔ جس طرح نباتات کی دنیا میں پہلے درخت بویا جاتا ہے، اس کے بعد پھل حاصل کیا جاتا ہے۔ اسی طرح انسانی سماج میں پہلے صلاحیت پیدا کی جاتی ہے، اس کے بعد اس کا نتیجہ سامنے آتا ہے۔ اس ترتیب کو الٹنا فطرت سے لڑنا ہے، اور فطرت سے لڑنے والا شخص کبھی کامیاب نہیں ہوتا۔

آخری بات

ملک کے موجودہ حالات میں کچھ لوگ مایوسی کا شکار ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کے پاس کہنے کے لئے کچھ نہیں۔ وہ صرف تشویشناک ذہن کے ساتھ ملک کے غیر یقینی مستقبل کا انتظار کر رہے ہیں۔ دوسرا طبقہ وہ ہے جس کو پرامید طبقہ کہا جا سکتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ موجودہ حالات ایک تخلیقی ابال (creative ferment) یا ایک تحویلی شورش (transitional turmoil) کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مگر ان کے پاس بھی کہنے کے لئے کوئی واضح اور مثبت بات نہیں۔ دونوں میں فرق صرف یہ ہے کہ پہلا گروہ اگر مجہول ناامیدی میں مبتلا ہے تو دوسرا گروہ مجہول امید میں۔

اصل یہ ہے کہ موجودہ حالات لوگوں کی بے شعوری کے نتیجہ میں پیدا ہوئے ہیں۔ اور لوگوں کو باشعور بنا کر ہی ان حالات کو درست کیا جا سکتا ہے۔ قوم کو باشعور بنانا ایک مستقل کام ہے۔ یہ کام ترقی یافتہ ملکوں (مثلاً امریکہ اور جاپان) میں بہت بڑے پیمانہ پر کیا گیا ہے۔ اس کے بعد ہی یہ ممکن ہوا کہ یہ ممالک موجودہ ترقی کے درجہ تک پہنچ سکیں۔

مگر ہندستان میں قوم کی شعوری تعمیر کا کام سرے سے انجام نہیں دیا گیا۔ نہ ۱۹۴۷ سے پہلے اور نہ ۱۹۴۷ کے بعد۔ مجھے پچھلے سو سال کے اندر کوئی ایک بھی ایسی سنجیدہ کوشش نظر نہیں آتی جس کو حقیقی معنوں میں تعمیر شعور کی مہم کا عنوان دیا جا سکے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں ہماری قومی امیدیں ناکام ہوئی ہیں، اور یہی وہ مقام ہے جہاں عمل کر کے ہم اپنی قومی امیدوں کو دوبارہ اپنے حق میں واقعہ بنا سکتے ہیں۔



حج کا سفر خدا کی طرف سفر ہے۔ حج حق تعالیٰ سے ملاقات ہے۔ دوسری عبادتیں اللہ تعالیٰ کی یاد ہیں جب کہ حج خود اللہ تعالیٰ تک پہنچ جانا ہے۔ عام عبادت اگر غیب کی سطح پر خدا کی عبادت ہے تو حج شہود کی سطح پر خدا کی عبادت کرنا ہے۔

(صفحات ۱۱۲ قیمت ۳۰، مختصر: صفحات ۴۸ قیمت ۵ روپیہ)

ایک سفر

جغرافی اعتبار سے کرۂ ارض کو دو نصف حصہ (Hemisphere) میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک مشرقی نصف حصہ (Eastern Hemisphere) اور دوسرا مغربی نصف حصہ (Western Hemisphere) پہلے نصف میں یورپ، ایشیا، افریقہ، آسٹریلیا شامل ہیں۔ دوسرے نصف میں امریکہ اور بحر الکاہل (Pacific ocean) واقع ہیں۔

پچھلے ۲۰ سال کے دوران مجھے بار بار بیرونی دنیا کے سفر پیش آئے ہیں۔ مگر میرے اب تک کے تمام سفر مشرقی نصف کرہ میں ہوئے ہیں۔ مغربی نصف کرہ میں سفر کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ موجودہ سفر اسی مغربی نصف کرہ ارض میں ہوا۔ یعنی دہلی سے ٹوکیو، اور ٹوکیو سے لاس انجلیز۔ اور پھر اسی راستہ سے دہلی کے لئے واپسی۔ اس طرح اب میرے اسفار میں پورا کرۂ ارض طے ہو گیا۔ یہ انسان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا کیسا عجیب معاملہ ہے کہ وہ فضا کی بلندیوں میں اڑتے ہوئے پورے کرۂ ارض کا احاطہ کر لیتا ہے، بغیر اس کے کہ کوئی پہاڑ یا کوئی سمندر اس کی راہ میں حائل ہوا ہو۔

امریکی حکومت ویزا دینے کے بارہ میں بہت فراخ دل ہے۔ میرے سفر کے سلسلہ میں ایک مہینہ کے ویزا کی درخواست دی گئی تھی۔ مگر نئی دہلی کے امریکی سفارت خانہ نے بطور خود ایک سال کا ملٹی پل ویزا (Multiple visa) دے دیا۔ ۱۹۸۹ میں نئی دہلی کے امریکی سفارت خانہ نے 58500 ویزا جاری کئے تھے۔

مگر اسی کے ساتھ بے اصولی کرنے والوں کے لئے امریکی انتظامیہ بے حد سخت بھی ہے۔ جو لوگ ویزا کے لئے غلط قسم کے کاغذات پیش کریں۔ ان پر ساری عمر کے لئے امریکہ میں داخلہ بند کر دیا جاتا ہے۔ مثلاً بعض لوگ اسٹوڈنٹ ویزا پر امریکہ گئے۔ وہاں پہنچ کر انھوں نے غیر قانونی طور پر کام کرنا شروع کر دیا۔ اس طرح کے واقعات کی بنا پر یہ قاعدہ بنایا گیا ہے کہ جو شخص ویزا کی درخواست میں غلط اندراج کرے یا فرضی ڈاکومنٹ پیش کرے، اس کو ساری زندگی کبھی امریکہ میں داخلہ کا ویزا نہ دیا جائے (ہندستان ٹائمس ۱۳ جون ۱۹۹۰)

۱۸ اور ۱۹ نومبر ۱۹۹۰ کی درمیانی رات کو ۱۲ بجے گھر سے ایرپورٹ کے لئے روانہ ہوا۔ راستہ

میں دوجگہ ٹرکوں کی لمبی لائن لگی ہوئی تھی۔ معلوم ہوا کہ آجکل ڈیزل کی سپلائی کم کردی گئی ہے۔ نیز رات کو صرف چند پٹرول پمپ کھلے ہوتے ہیں۔ اس لئے یہ لمبی لائن ہے۔ ہر لائن میں سو کے قریب ٹرک کھڑے ہوئے نظر آئے۔ میں نے سوچا کہ یہاں ٹرک ہے۔ انجن لگی ہوئی گاڑی ہے۔ ڈرائیور بھی اس کے اندر بیٹھا ہوا ہے۔ غرض ہر چیز موجود ہے، صرف ایک چیز "ایندھن" نہیں ہے۔ اس کی وجہ سے تمام گاڑیاں کھڑی ہوگئیں۔ ایک "ٹرک" ایندھن کے بغیر نہیں چل سکتا۔ پھر اتنی بڑی کائنات کس طرح ایندھن کے بغیر ۲۰ بلین سال سے چل رہی ہے۔ آدمی اگر اس پر سوچے تو اس کے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔

دہلی سے جاپان ایئرلائنز کی فلائٹ ۴۹۲ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ راستہ میں پڑھنے کے لئے ایئرکمپنی کا میگزین ونڈس (Winds) موجود تھا۔ میں فلائٹ میگزین بہت دلچسپی کے ساتھ پڑھتا ہوں۔ مگر اس میں کوئی خاص چیز میرے پڑھنے کے لئے نہ تھی۔ تین سو صفحہ کا یہ رنگین چھپا ہوا میگزین زیادہ تر اشتہارات سے بھرا ہوا تھا۔ چند معمولی قسم کے مضمون تھے۔ مثلاً ایک مضمون جاپان کی رسلنگ پر تھا۔ ایک مضمون کا عنوان تھا:

A day in the life of a salary man.

جاپان مکمل طور پر ایک تجارتی ملک ہے۔ دنیا کو دینے کے لئے اس کے پاس بہترین صنعتی چیزیں ہیں۔ مگر علمی اور فکری ذوق رکھنے والوں کے لئے اس کے پاس کچھ نہیں۔

اشتہارات کے لئے بڑی پرکشش زبان استعمال کی گئی تھی۔ مثلاً کار بنانے والی ایک کمپنی کا اشتہار تھا۔ کار کی ایک خوب صورت تصویر بنی ہوئی تھی۔ اس کے نیچے لکھا ہوا تھا ـــــ تہذیب کے راستہ پر (on the road to civilization) ایک اشتہار میں ٹیلیویژن بنا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ کچھ تعارفی الفاظ لکھنے کے بعد یہ جملہ درج تھا کہ ٹکنالوجی انسانیت کو فائدہ پہنچانے کے لئے:

Technology for the benefit of mankind

میں نے سوچا کہ ایک مصلح بھی وہی زبان بولتا ہے جو ایک تاجر بولتا ہے۔ مگر دونوں میں ایک فرق ہے۔ تاجر کا اصل مقصد تجارت ہے۔ مگر وہ شخصی الفاظ نہ بول کر عمومی انسانی الفاظ بولتا ہے۔ مگر مصلح جو لفظ بولتا ہے وہی

اس کا اصل مقصد بھی ہوتا ہے۔ گویا تاجر کی شخصیت میں ثنویت ہوتی ہے اور مصلح کی شخصیت میں وحدت۔

قدیم زمانہ میں دو قسم کی سواریاں رائج تھیں۔ ایک بری اور دوسرے بحری۔ موجودہ زمانہ میں تیسری سواری وجود میں آئی ہے جو باعتبار نوعیت ابتدائی دونوں قسم کی سواریوں سے یکسر مختلف ہے۔ یہ ہوائی سواری ہے۔ آج ہوائی سواری اس سے بھی زیادہ عام ہے جتنا قدیم زمانہ میں بری یا بحری سواری عام تھی۔ قدیم سواریوں میں تکمیل سفر کے بعد آدمی "اندر سے باہر" آتا تھا۔ جدید سواری میں وہ "اوپر سے نیچے" اترتا ہے۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اولاد آدم ایک دوسرے کی دشمن ہوگی۔ یہ دشمنی (عداوت) ایک اخلاقی برائی ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ یہی دشمنی (یا کامپٹیشن) دنیا کی تمام ترقیوں کا واحد سب سے بڑا ذریعہ ثابت ہوئی۔ ابتدائی قسم کا ہوائی جہاز سب سے پہلے دو شخصوں نے ۱۷ دسمبر ۱۹۰۳ کو اڑایا تھا۔ مگر اس فن کی ترقی صرف اس وقت شروع ہوئی جب کہ فرانس اور جرمنی نے اس میں جنگی افادیت (war potential) کو محسوس کیا۔ ان دونوں ملکوں نے اس "فلائنگ مشین" کو ترقی دینا شروع کیا۔ تاکہ وہ بوقت جنگ اس کو استعمال کر سکیں۔ اگست ۱۹۱۴ میں پہلی عالمی جنگ شروع ہوئی تو فرانس نے تقریباً دو ہزار ہوائی جہاز تیار کر لئے تھے اور جرمنی کے پاس ایک ہزار جنگی جہاز تھے۔ ہوائی جہاز کی صنعت نے ابتداءً جنگ کی برکت سے ترقی کی۔ ۱۹۱۹ میں جب پہلی باقاعدہ کمرشیل فلائٹ کا آغاز ہوا تو وہ بھی زیادہ تر استعماری عزائم کے تحت تھا ــــــ جنگ پسندوں نے ابتداءً ہوائی جہاز کو ترقی دی، اس کے بعد امن پسندوں کو بھی اس کا ایک حصہ مل گیا۔

رابرٹ رنسی (Robert Runcie) ۱۹۲۱ میں پیدا ہوئے۔ وہ کیتھولک چرچ میں آرک بشپ آف کینٹربری کے منصب پر ہیں۔ سفر کی بابت انھوں نے ایک دلچسپ بات کہی۔ انھوں نے کہا کہ قرون وسطیٰ میں لوگ مذہب کے لئے سفر کرتے تھے۔ جب کہ آج وہ اس لئے سفر کرتے ہیں کہ سفر ان کا مذہب ہے:

In the middle ages people were tourists because of their religion, whereas now they are tourists because tourism is their religion.

ہماری پہلی منزل بینکاک تھی جو تھائی لینڈ کا سب سے بڑا شہر ہے۔ یہاں ایئر پورٹ پر تقریباً

ایک گھنٹہ گزرا۔ ایرپورٹ بہت صاف ستھرا اور منظم تھا۔ ٹائیلٹ سے لے کر باہر کے مقامات تک کہیں کوئی تنکا یا دھبہ نظر نہیں آیا۔

طالب علمی کے زمانہ میں مجھے ڈاک ٹکٹ جمع کرنے کا شوق تھا، مجھے ایک ٹکٹ ملا جس پر سیام لکھا ہوا تھا۔ یہ غالباً ۱۹۳۹ کی بات ہے۔ اس وقت جو ملک "سیام" کہا جاتا تھا، اس کا موجودہ نام تھائی لینڈ ہے۔ پچاس برس پہلے یہ ٹکٹ صرف کاغذی ٹکڑے کی حیثیت رکھتا تھا۔ آج وہ ٹکٹ اگر موجود ہو تو وہ نہایت قیمتی شمار ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پچاس برس پہلے وہ صرف ڈاک کا ایک ٹکٹ تھا، مگر آج وہ تاریخ کی ایک دستاویز بن چکا ہے۔

تھائی لینڈ کی راجدھانی بینکاک ہے۔ بینکاک کی آبادی پچاس لاکھ سے زیادہ ہے۔ یہی شہر تھائی لینڈ کی تمام سیاسی اور تمدنی سرگرمیوں کا مرکز ہے۔ چنانچہ تھائی لینڈ کے تمام روزنامے بینکاک سے نکلتے ہیں۔ اسی طرح یہاں کے بیشتر ہفت روزہ اور ماہنامہ پرچے بھی۔ یہ پرچے تھائی، انگلش اور چینی زبانوں میں ہوتے ہیں۔

جہاز بینکاک سے ٹوکیو کے لئے روانہ ہوا تو راستہ میں پڑھنے کے لئے تھائی لینڈ کا انگریزی اخبار نیشن (The Nation) تھا۔ اس کے شمارہ ۱۹ نومبر ۱۹۹۰ کا مطالعہ کیا۔ ایک خبر میں بتایا گیا تھا کہ برما کی فوجی حکومت نے مخالف برمی طلبہ کی داروگیر کی تو ۲۰۰۰ طلبہ وہاں سے بھاگ کر تھائی لینڈ آگئے ان میں سے تقریباً ۸۰۰ طلبہ اقوام متحدہ کے ادارہ مہاجرین: (UNHCR)

United Nations High Commissioner for Refugees

کے تحت رجسٹرڈ ہیں، ان کو ادارہ کی طرف سے پناہ گزیں کے طور پر ماہانہ الاؤنس (Bt. 3,000) ملتا ہے۔ مگر تھائی لینڈ کی حکومت ان برمی طلبہ کے خلاف ہوگئی ہے۔ حکومت کا کہنا ہے کہ بار بار کی تنبیہ کے باوجود یہ لوگ پرامن قیام پر راضی نہیں۔ وہ تھائی لینڈ کو بیس بنا کر برمی حکومت کے خلاف سرگرمیوں (anti-Rangoon political activity) میں مصروف ہیں۔ تھائی لینڈ میں مقیم برمی طلبہ دو جہازوں کو ہائی جیک کر چکے ہیں ایک اکتوبر ۱۹۹۰ میں دوسرا نومبر ۱۹۹۰ میں۔ انھوں نے کہا:

They had made the move to publicize
the Burmese people's struggle to democracy.

برمی طلبہ کی تنظیم (All Burma Students Democratic Front) کے لیڈر نے کہا کہ ہماری تنظیم کا کوئی تعلق ہائی جیکنگ کے اس قابل مذمت واقعہ سے نہیں ہے۔ وہ ہمارے کچھ برے افراد (few bad individuals) نے کیا تھا۔ اسی قسم کے جواب ہندستان میں مسلمانوں کے نام نہاد لیڈر بھی دیتے ہیں۔ مگر یہ جواب ان کے لئے عذر نہیں۔ کیوں کہ "برے افراد" کا ہاتھ پکڑنے کی ذمہ داری سب سے پہلے ان کی قوم پر آتی ہے۔ جب کوئی قوم اپنے برے افراد کے ہاتھ نہ پکڑے تو خدائی قانون کے مطابق اُن افراد کی برائی کی قیمت پوری قوم کو بھگتنی پڑے گی۔

ایک امریکی جرنلسٹ ملے۔ ان سے خلیج کے بحران کی بابت گفتگو ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ سفارتی ذرائع سے مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش مشکل ہو سکتی ہے۔ لیکن اگر جنگ ہو تو اس میں بہت سی جانیں ضائع ہوں گی اور اس سے امریکہ کے مفادات کو نقصان پہنچے گا:

A diplomatic solution may be messy, but fighting would cost too many lives and damage America's interests.

اس جواب سے امریکی ذہن کا اندازہ ہوتا ہے۔ خلیج کا مسئلہ ۲ اگست ۱۹۹۰ کو پیدا ہوا۔ امریکی فوجیں اس کے فوراً بعد خلیج میں پہنچ گئیں۔ وہ جدید ترین سامان جنگ کے ساتھ عراق اور کویت کی سرحدوں پر موجود ہیں۔ مگر اب تک امریکہ نے کوئی جنگی اقدام نہیں کیا۔ کیوں کہ ان کا مذہب "انٹرسٹ" ہے، اور انٹرسٹ کے نقطۂ نظر سے جنگی کارروائی کا فائدہ مشتبہ نظر آتا ہے۔ اس کے برعکس اگر کوئی مسلم ملک اتنی بڑی طاقت کے ساتھ وہاں موجود ہوتا تو اب تک جنگ کا آغاز اور اختتام دونوں ہو چکا ہوتا۔ خواہ اس کے نتیجہ میں "شہیدوں" کی لاشوں کے سوا اور کوئی چیز مسلم دنیا کے حصہ میں نہ آئے۔ (۱۹ نومبر ۱۹۹۰)

ایک اور امریکی جرنلسٹ سے گفتگو ہوئی۔ وہ ہندستان کے سیاسی حالات سے واقف تھا۔ اس نے کہا کہ آپ کے ملک میں منڈل کمیشن اور رام جنم بھومی کے مسائل پیش آئے۔ آپ کے سابق وزیر اعظم مسٹر وی پی سنگھ لوگوں کو مطمئن نہ کر سکے۔ چنانچہ پارلیمنٹ میں انھیں عدم اعتماد کی تحریک کا سامنا کرنا پڑا جس میں انھیں ۳۴۶ کے مقابلہ میں صرف ۱۴۲ ووٹ ملے۔ انھوں نے ۷ نومبر کو اپنا استعفا صدر کے پاس بھیج دیا۔ امریکہ کے لوگوں میں بھی صدر بش کے خلاف ناراضگی (resentment) .

ہے۔ مگر ہمارے صدر جارج بش خوش قسمت ہیں کہ وہ وزیر اعظم نہیں۔ اگر وہ وزیر اعظم ہوتے تو یقیناً آج انھیں بھی عدم اعتماد کی تحریک کا سامنا کرنا پڑتا:

Mr Bush is lucky that he is not a Prime Minister -- he would surely have been facing a non-confidence motion.

اس سے ہندستان اور امریکہ کے نظام حکومت کے فرق کا اندازہ ہوتا ہے۔ ہندستان میں وزیر اعظم اور صدر حکومت کا عہدہ الگ الگ ہے۔ امریکہ میں یہ دونوں عہدے ایک شخص کی ذات میں جمع ہوتے ہیں۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ امریکی صدر دنیا کا سب سے زیادہ طاقتور انسان ہوتا ہے۔

۱۹ نومبر کو دوپہر سے کچھ پہلے ٹوکیو پہنچا۔ یہاں جہاز بدلنا تھا، اس لئے چند گھنٹے ٹوکیو ایئرپورٹ پر گزرے۔ یہاں میں نے ایئرپورٹ کے ایک شخص سے "ٹوائلٹ" کے بارہ میں پوچھا۔ وہ غالباً انگریزی نہیں جانتا تھا، وہ مجھے بتائے بغیر آگے چلا گیا۔ اتنے میں ایک صاحب میرے قریب آئے۔ انھوں نے اردو میں بولتے ہوئے کہا کہ کیا آپ کو ٹوائلٹ جانا ہے۔ آئیے میں آپ کو لے چلتا ہوں۔ ہم ایک سیڑھی سے نیچے اترے تو وہاں نہایت صاف ستھرا ٹوائلٹ موجود تھا۔

میں نے فراغت کے بعد وضو کیا۔ باہر نکلا تو مذکورہ صاحب دوبارہ ملے۔ انھوں نے بتایا کہ میرا نام محمد راشد ہے۔ میں دہلی میں رہتا ہوں اور اکسپورٹ کا کام کرتا ہوں۔ کئی بار جاپان آچکا ہوں۔ ٹوکیو میں ایک اردو داں کو پاکر خوشی ہوئی۔ میں نے کہا کہ مجھے نماز پڑھنا ہے۔ یہاں قبلہ کی سمت معلوم کرنا بے حد مشکل ہے۔ اندازہ کر کے ایک طرف پڑھ لیتا ہوں۔ انھوں نے فوراً اپنے بیگ سے ایک "قبلہ نما" اور ایک کتابچہ نکالا۔ اور اندازہ کر کے بتایا کہ یہ قبلہ کا رخ ہے۔ چنانچہ میں نے اس کے مطابق ایئرپورٹ پر نماز ادا کی۔

میں نے سوچا کہ یہ بھی کیسی عجیب بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اہل اسلام کے لئے ایک مرکزی رخ مقرر کیا اور اسی کے ساتھ دنیا میں ایسے ذرائع پیدا کر دئے کہ دنیا کے کسی بھی گوشہ میں اور کسی بھی مقام پر اس مرکزی رخ کو بالکل ٹھیک ٹھیک معلوم کیا جا سکے۔ اتنے اعلیٰ اجتماعی انتظام کے بعد بھی اگر مسلمان متحد نہ ہوں تو یہ سادہ طور پر محض ایک کوتاہی نہیں ہے بلکہ یہ خداوند عالم کی ناقدری ہے۔

ٹوکیو ایئرپورٹ پر اور جاپانی جہاز میں بہت سے تجربات ہوئے جن کا ذکر میں سفرنامہ کے آخر میں کروں گا۔

ٹوکیو سے لاس اینجلز کے لئے جاپان ایئر لائنز کی فلائٹ نمبر ۶۲ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ یہ دس گھنٹہ کی مسلسل پرواز تھی جو پوری کی پوری بحر الکاہل کے اوپر طے ہوئی۔ کرۂ ارض کا تقریباً ۷۱ فی صد حصہ سمندروں سے گھرا ہوا ہے۔ ان میں سب سے بڑا سمندر بحر الکاہل (Pacific Ocean) ہے۔ متصل سمندروں کو چھوڑتے ہوئے صرف بحرالکاہل تمام سمندروں کا ۴۵ فیصد حصہ ہے۔ اس کی اوسط گہرائی ۱۲۹۲۵ فٹ ہے۔ ایک ساحل سے دوسرے ساحل تک اس کا فاصلہ تقریباً گیارہ ہزار میل ہے۔

اس عظیم سمندر کے مقابلے میں تمام انسانوں کی مجموعی تعداد ایک چیونٹی سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی۔ مگر یہی انسان اس کے اوپر فاتحانہ پرواز کرتے ہوئے ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہنچتا ہے۔ انسان کے اوپر اللہ تعالیٰ کا یہ کیسا عجیب احسان ہے۔ میں نے نیچے سمندر کی لہروں کو دیکھا تو ایسا محسوس ہوا جیسے یہ لہریں کہہ رہی ہوں کہ اے انسان، ان احسانات کو سوچ کر تیرے اندر شکر خداوندی کا سیلاب امنڈ پڑنا چاہئے۔ مگر دنیا میں شاید ہی کوئی انسان ہو جس نے سمندر کی ان بیتاب لہروں میں اس کے ربانی پیغام کو سنا ہو۔

میں ہمیشہ صرف ایک ہینڈ بیگ کے ساتھ سفر کرتا ہوں۔ مگر اس بار میرے ساتھ کتابوں کے دو بڑے بنڈل تھے جس کی فرمائش امریکہ کی ایک تنظیم کی طرف سے کی گئی تھی۔ ۱۹ نومبر کی شام کو میں لاس اینجلز کے ہوائی اڈہ پر اترا تو سب سے پہلے مجھے ان دونوں بنڈلوں کو حاصل کرنا تھا۔ ایک جگہ ہوائی اڈہ کی مخصوص گاڑیاں کھڑی تھیں جن پر سامان رکھ کر لوگ باہر لے جاتے ہیں۔ میں نے ایک گاڑی لینا چاہا تو وہ ایک اڈے سے چپکی ہوئی نظر آئی۔ معلوم ہوا کہ اس کا کرایہ ایک ڈالر ادا کرنا ہے۔ میں نے ایک مخصوص مشین کے اندر ایک ڈالر کا نوٹ ڈالا۔ اس کے بعد گاڑی اپنے آپ چھوٹ کر باہر آگئی۔ جس دنیا میں اس طرح فی الفور نتائج نکلتے ہوں وہاں موت کے بعد نکلنے والے نتائج پر یقین کرنا کتنا مشکل کام ہے۔

کتابوں کا بنڈل لے کر ایئرپورٹ کے بیرونی گیٹ پر آیا تو وہاں جناب ڈاکٹر مزمل حسین صدیقی موجود تھے۔ وہ اسلامک سوسائٹی آف آرنج کاؤنٹی کے ڈائرکٹر ہیں اور بڑی عجیب خوبیوں کے آدمی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ اس قسم کے ادارہ کے لئے آئیڈیل ڈائرکٹر ہیں۔ ان کے ساتھ بذریعہ روڈ گارڈن گروو پہنچا جہاں مجھے قیام کرنا تھا۔

ایک شخص جو لاس اینجلز کے شاندار ہوائی اڈہ پر اترے اور اس کے بعد پر رونق سڑکوں

پر سفر کرتا ہوا اپنی منزل کی طرف روانہ ہو، وہ مشکل سے یہ سوچ سکتا ہے کہ اس خوب صورت دنیا میں کچھ سیاہ دھبے بھی ہیں۔ مگر واقعہ یہی ہے۔

ایک رپورٹ (ٹائم ۱۸ جون ۱۹۹۰) کے مطابق، لاس اینجلز میں ماں باپ سے باغی یا بچھڑے ہوئے لڑکے بڑی تعداد میں رہتے ہیں۔ ان کے ۵۰۰ سے زیادہ گینگ ہیں جن سے تقریباً ۸ ہزار لڑکے وابستہ ہیں۔ ان لوگوں کے پاس پستول اور بندوق جیسے ہتھیار ہوتے ہیں۔ وہ قتل اور چوری اور منشیات جیسے جرائم میں مبتلا رہتے ہیں۔

ٹائم میگزین کے رپورٹر نے ایک پندرہ سالہ لڑکے سے پوچھا کہ تم نے فلاں آدمی کو کیوں قتل کیا۔ اس نے کہا کہ وہ ایک دشمن تھا۔ وہ دشمن کیوں تھا، لڑکا اس کا کوئی جواب نہ دے سکا۔ اس نے کہا کہ مجھے اس قسم کے فعل پر کوئی ندامت نہیں۔ وقتی طور پر کچھ احساس ابھرتا ہے، اس کو ختم کرنے کے لئے میں قتل سے پہلے شراب پی لیتا ہوں (صفحہ ۲۰)

ٹائم نے اپنی تین صفحہ کی باتصویر رپورٹ ان الفاظ پر ختم کی ہے کہ لاس اینجلز کے اندرون شہر کے یہ نوجوان، زمین کے سب سے زیادہ ترقی یافتہ سماج کے بیچ میں رہتے ہیں۔ وہ مصیبت زدگی اور محرومی کا جواب قدیم قبائل کی بھونڈی نقل کی طرف واپسی کے ذریعہ دے رہے ہیں:

> ...while inner-city youth of Los Angles, at the center of the most advanced society of earth, respond to adversity and deprivation by regressing to a primitive parody of tribes (p. 22).

امریکہ کے لئے میرا موجودہ سفر ایسے وقت میں ہوا جب کہ امریکی فوجیں اگست ۱۹۹۰ سے خلیج میں عراق کا محاصرہ کئے ہوئے ہیں۔ قدرتی طور پر آجکل یہاں کے اخبارات میں سب سے زیادہ اسی کا چرچا ہوتا ہے۔ ایک اخبار میں اس موضوع پر مفصل مضمون تھا۔ اس کے چند حصے یہ ہیں:

صدام حسین ایک غیر فوجی آدمی ہیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ امریکہ خلیج سے نو ہزار میل کی دوری پر ہے۔ اس کی فوجوں کو یہاں پہنچنے میں کئی دن لگ جائیں گے۔ وہ امریکہ کی مدد پہنچنے سے پہلے کویت اور سعودی عرب دونوں کو زیر کرنے میں کامیاب ہو چکے ہوں گے۔ مگر عراق کے اقدام کے بعد امریکہ نے انتہائی سرعت کے ساتھ ایک لاکھ سے زیادہ فوجیوں کو خلیج میں پہنچا کر تمام دنیا کو حیران کر دیا۔ امریکہ نے

نہ صرف عراق کو گھیر لیا ہے بلکہ اس کے خلاف کارروائی کے لئے اپنے ہدف مقرر کر لئے ہیں۔ امریکہ کا بمبار ۲ ۵ وہ فوجی طیارہ ہے جو چالیس ٹن وزنی بم اٹھا سکتا ہے۔ ایسے ۲۰ طیارے عراق کی تمام اہم تنصیبات کو چند گھنٹوں کے اندر تباہ کر سکتے ہیں۔ یہ ویت نام نہیں جہاں غیر موافق جغرافیہ کی وجہ سے امریکہ کو ہدف نہیں ملتا تھا۔ یہ تو صحرا ہے جہاں ہدف خود طیارے کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے۔

صدام حسین کو معلوم ہو چکا ہے کہ امریکہ کے پاس اتنی طاقت ہے کہ وہ ان کے طیاروں اور میزائلوں کو فضا میں ابھرنے سے پہلے ہی تباہ کر سکتا ہے۔ اسی لئے انھوں نے امریکہ کے "آپریشن ڈیزرٹ شیلڈ" کا مقابلہ "آپریشن ہیومن شیلڈ" سے کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ فیصلہ صرف صدام حسین کی انتہائی بے بسی کو ظاہر کرتا ہے۔ (ٹائم میگزین ۳۱ دسمبر ۱۹۹۰ کے بیان کے مطابق، یکم فروری ۱۹۹۱ تک امریکی فوجیں چار لاکھ تیس ہزار کی تعداد میں خلیج میں پہنچ چکی ہوں گی)

امریکہ کو دریافت کرنے والے کی حیثیت سے کولمبس کو زیادہ شہرت حاصل ہے۔ مگر امریکہ کا نام کولمبس کے نام پر نہیں۔ اس کا نام اٹلی کے ایک تاجر امریگو (Amerigo Vespucci) کے نام پر ہے۔ امریگو کے بارہ میں کہا جاتا ہے کہ وہ ۱۴۹۷ میں امریکہ پہنچا تھا۔ جب کہ کولمبس اس سے کئی سال پہلے امریکہ کے ساحل پر اتر چکا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کولمبس کی دریافت کے باوجود امریکہ کو ایشیا ہی کا ایک حصہ سمجھا جاتا تھا۔ امریگو کی مہم نے یہ ثابت کر دیا کہ امریکہ ایک علیحدہ براعظم ہے:

He established that the newly discovered lands West of the Atlantic were not a part of Asia but constituted a separate land mass (19/97).

کولمبس کا نام مشہور ہے مگر امریکہ اس کے نام پر نہیں۔ امریگو کا نام مشہور نہیں مگر امریکہ کو اسی کی نسبت سے امریکہ کہا جاتا ہے۔ ایک کی ذات نے شہرت پائی اور دوسرے کے کام نے۔

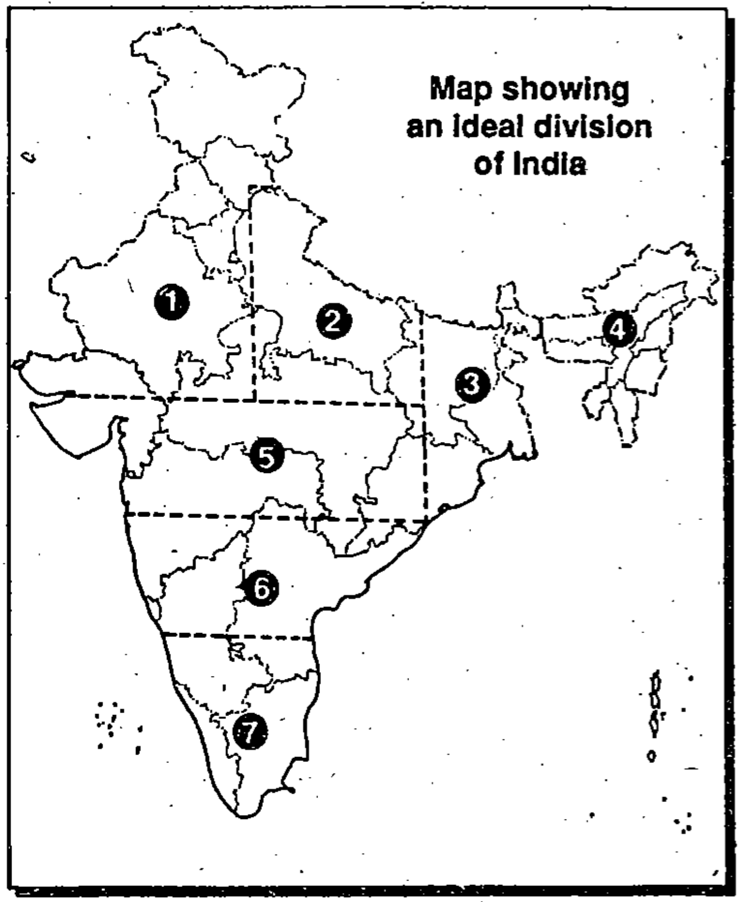
امریکہ کا نقشہ آپ سامنے رکھیں تو آپ پائیں گے کہ اس میں ریاستوں کی حد بندی بالکل حسابی انداز میں سیدھی لکیروں کی صورت میں کی گئی ہے۔ نقشہ کو دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ امریکہ ایک ترقی یافتہ ملک ہے۔

اس کے برعکس ہندستان کا نقشہ دیکھئے۔ اس میں ریاستی سرحدوں کی تقسیم ٹیڑھی میڑھی (zig zag) صورت میں نظر آئے گی۔ ہندستان کے کچھ اہل علم کی رائے ہے کہ اس معاملہ میں انڈیا کے

نقشہ کو جدید معیار پر لایا جائے۔ مثال کے طور پر ٹائمس آف انڈیا (۲۲ جون ۱۹۹۰) میں مسٹر پردیپ شنائے (Pradeep Shenoy) کا مضمون چھپا تھا۔ انھوں نے ہندستان میں ریاستوں کا نقشہ امریکی انداز میں مقرر کرنے کی تجویز پیش کی تھی۔ ان کا مجوزہ نقشہ نیچے درج کیا جاتا ہے۔

۱۹۴۷ سے پہلے کانگرس پارٹی نے عوام کو اپنے ساتھ لینے کے لئے جو وعدے کئے ان میں سے ایک یہ تھا کہ ریاستوں کی تقسیم لسانی بنیاد پر کی جائے۔ یہ خالص مصلحت پرستانہ سیاست تھی۔ اس کی قیمت ہندستان کو یہ دینی پڑی کہ آزادی کے بعد لسانی ریاستوں کا مطالبہ نہایت شدت کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔ نہرو اب اس کے موافق نہ تھے۔ مگر انھوں نے محسوس کیا کہ اگر ہم نے اس مطالبہ کو نہ مانا تو کانگرس کے لئے ریاستوں میں الکشن جیتنا مشکل ہو جائے گا۔ دوبارہ مصلحت پرستانہ سیاست کے تحت ملک کی تقسیم زبان کی بنیاد پر کر دی گئی۔

امریکہ میں قیام کے دوران میں زیادہ تر جناب صغیر اسلم صاحب کے ساتھ رہا۔ ان کو میں نے الرسالہ کا ایک مضمون یاد دلایا۔ میں نے کہا کہ میں آپ کے ساتھ اس طرح رہنا چاہتا ہوں کہ میں آپ کے لئے کسی بھی اعتبار سے مسئلہ نہ بنوں بلکہ کامل طور پر "مسٹر نو پرابلم" بن کر رہوں۔ مثلاً کھانے میں آپ میرے



لئے کسی بھی قسم کا کوئی اہتمام نہ کریں۔ جو کچھ آپ روزمرہ کھاتے تھے، بس وہی مجھ کو کھلائیں۔ ان کی اہلیہ خوش قسمتی سے نہایت سادہ مزاج کی ہیں، اس لئے اس شرط پر عمل کرنے میں کوئی زحمت پیش نہیں آئی۔

صغیر اسلم صاحب کے ساتھ لمبی مدت تک رہ کر مجھے اندازہ ہوا کہ ان کے مزاج میں اور میرے مزاج میں بہت زیادہ مطابقت ہے۔ یہاں کے لوگوں میں وہ اپنے مزاج کے اعتبار سے ایک منفرد انسان نظر آتے ہیں۔ انھوں نے ایک روز کہا :

After the Almighty God made me, He threw the mould away.

میں نے کہا کہ اس میں اتنی تبدیلی کر لیجئے کہ اس مولڈ سے اللہ تعالیٰ نے دو انسان بنائے۔ ایک آپ کو اور دوسرے مجھ کو۔ آپ اس مولڈ کا (finished product) ہیں اور میں اس مولڈ کا (unfinished product) ہوں۔

یہاں پہلے دن میں ڈاکٹر مزمل حسین صدیقی کے ساتھ ٹھہرا تھا۔ اس کے بعد آخر وقت تک میرا قیام جناب صغیر اسلم صاحب کے یہاں رہا۔ یہ دونوں صاحبان بہت زیادہ میرے ہم مذاق ہیں۔ ڈاکٹر مزمل حسین صدیقی اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ نہایت سنجیدہ اور متواضع انسان ہیں۔ ان سے گفتگو کر کے بہت خوشی ہوتی ہے۔ وہ یہاں اسلامک سوسائٹی کے ڈائرکٹر ہیں۔ اسی کے ساتھ اپنے گھر پر بھی انھوں نے اسلامی ماحول بنا رکھا ہے۔ وہ اس بات کی ایک مثال ہیں کہ کس طرح آدمی ہر ماحول کے اندر اپنا ماحول بنا سکتا ہے۔ ایک صاحب جو "اسلامی حکومت" قائم کرنے کے علمبردار ہیں، انھوں نے ڈاکٹر صاحب پر نقد کرتے ہوئے کہا کہ آپ اتنے دنوں سے امریکہ میں ہیں۔ آپ نے یہاں کیا کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا : آپ میرے کام کو میرے معیار سے جانچئے نہ کہ اپنے بنائے ہوئے معیار سے۔ میں نے تو الحمد للہ بہت کچھ کیا ہے۔ یہ آپ کو بتانا ہے کہ آپ اتنے دنوں سے اسلامی حکومت کی تحریک چلا رہے ہیں۔ آپ نے کیا کیا۔

صغیر اسلم صاحب بزنس کرتے ہیں۔ وہ بہت خوبیوں کے آدمی ہیں۔ ان کا ایک اصول مجھے بہت پسند آیا۔ اس کو میں اپنے لفظوں میں "چلو یہ بھی ٹھیک ہے، پرنسپل" کہتا ہوں۔ جب بھی کسی سے کوئی اختلافی بات پیدا ہو تو فوراً وہ یہ کہہ کر بات کو وہیں ختم کر دیتے ہیں کہ "چلو یہ بھی ٹھیک ہے"۔ یہ اصول وہی ہے جس کو اعراض کہا جاتا ہے۔

(باقی آئندہ)

۱۔ مسٹر شاہد چودھری نے ۱۴ فروری ۱۹۹۱ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ ان کا تعلق جس پرچہ سے ہے وہ بیک وقت دو زبانوں میں چھپتا ہے۔ ہندی میں اس کا نام مایا ہے اور انگریزی میں اس کا نام پروب انڈیا ہے۔ انٹرویو کا تعلق زیادہ تر خلیج کے مسئلہ سے تھا۔

۲۔ اندر دھنش ویڈیو میگزین (نئی دہلی) کی ٹیم ۱۵ فروری ۱۹۹۱ کو اسلامی مرکز میں آئی اور اپنے ویڈیو میگزین کے لئے صدر اسلامی مرکز کا ویڈیو انٹرویو ریکارڈ کیا۔ یہ پندرہ منٹ کا انٹرویو تھا۔ سوال وجواب زیادہ تر بابری مسجد کے مسئلہ کے بارہ میں تھے۔

۳۔ "خاتون اسلام" کا عربی ترجمہ اضافہ کے ساتھ تیار ہو گیا ہے۔ یہ ترجمہ ڈاکٹر ظفر الاسلام خاں اور مولانا رئیس احمد ندوی نے کیا ہے۔ اس میں کچھ اضافہ بھی کیا گیا ہے۔ انشاءاللہ عنقریب اس کو چھپوایا جا سکے گا۔

۴۔ نئی دہلی کے ایک انگریزی ماہنامہ (Indian Indications) نے مسلم مسائل پر صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ یہ انٹرویو دو صفحات پر اس کے شمارہ فروری ۱۹۹۱ میں شائع ہوا ہے۔

بنگلور کے حلقہ الرسالہ نے "انسان اپنے آپ کو پہچان" اور "حقیقت کی تلاش" کا ترجمہ کنڑا زبان میں چھپوایا۔ بنگلور میں غیر مسلم حضرات کا ایک کتابوں کا بڑا اسٹور ہے جس کا نام سپنا بک اسٹور ہے۔ ان کو یہ کتابیں دکھائی گئیں۔ انھوں نے پسند کر کے کچھ کتابیں اپنے یہاں رکھیں۔ یہ کتابیں جلد ہی فروخت ہو گئیں۔ خود صاحب اسٹور نے بھی ان کو پسند کیا۔ چنانچہ انھوں نے سارا اسٹاک لے لیا۔ انھوں نے بتایا کہ لوگوں نے ان کتابوں کو بہت پسند کیا۔ اور بہت کم مدت میں ساری کتابیں فروخت ہو گئیں۔

۵۔ ملیالم پرچوں میں برابر الرسالہ کے مضامین ترجمہ کر کے شائع کئے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ملیالم زبان میں مرکز کی کئی کتابوں کے ترجمے شائع ہو چکے ہیں۔ مثلاً: مذہب اور جدید چیلنج، حقیقت کی تلاش، اسلام کا تعارف، پیغمبر انقلاب، اسلام اور عصر حاضر، تاریخ کا سبق۔

وغیرہ

- پندرہ سال پہلے الرسالہ کی حقیقت پسندانہ پکار بالکل اجنبی معلوم ہوتی تھی۔ مگر آج تمام لوگ اسی کی بولی بولنے پر مجبور ہو رہے ہیں۔ مثال کے طور پر مولانا علی میاں پہلے جذباتی اقدام کے وکیل تھے۔ ان کے نزدیک مسلمانوں کے لئے رہنمائی اقبال کے اس شعر میں تھی کہ :

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق — عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

اب مولانا علی میاں کا بیان خلیج کے المیہ کے ذیل میں تعمیر حیات (۱۰ مارچ ۱۹۹۱) میں چھپا ہے۔ وہ موجودہ مسلمانوں کی ناکامی کا سبب بتاتے ہوئے کہتے ہیں : صدام حسین کے اقدام کا سب سے بڑا المیہ یہ ہوا کہ اسلام کی شہرت اور دعوت کو نقصان پہنچا۔ اسلام کا تعارف کرانے والوں کو آزمائش میں مبتلا ہونا پڑا۔ حالیہ واقعات سے یہ بات کھل کر سامنے آگئی کہ مسلمانوں میں شعور کی کمی ہے اور جذباتیت بہت بڑھی ہوئی ہے۔ یہاں تحریکوں کو چلانے میں جذبات کو برانگیختہ کرنے سے زیادہ کام لیا جاتا ہے۔ پورے برصغیر میں یہ کمزوری ہے کہ اگر کوئی شخص کسی مغربی طاقت کے خلاف زوردار لفظ بول دے تو وہ ہیرو بن جاتا ہے۔ ہر لفظ جس میں خطر پسندی ہو اسے سن کر مسلمان دیوانے ہو جاتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ نفع ونقصان کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیا جائے اور احتساب کیا جائے (صفحہ ۱۳)

مولانا علی میاں کے یہ الفاظ بلا اعلان اپنی غلطی کا اعتراف اور الرسالہ کے پیغام کی بالواسطہ تصدیق ہیں۔

۷۔ دعوتی جذبہ کے تحت الحمد للہ بہت سے لوگ دوسروں کے نام اپنی طرف سے الرسالہ جاری کراتے رہتے ہیں۔ مثلاً ناگپور کے جناب ایم شیخ نے اپنی طرف سے دس آدمیوں کے نام الرسالہ اردو، انگریزی، ہندی ایک سال کے لئے جاری کرایا ہے۔ یہ ایک بہت بڑا کار خیر ہے۔ اور دوسروں کے لئے بہترین مثال بھی ہے۔

۸۔ الرسالہ کے قارئین خاموشی سے ہر جگہ اسلامی پیغام کی اشاعت میں مشغول ہیں۔ مثلاً جناب بدر الدین احمد مراد آبادی نے بتایا کہ ایک ہندو فرم کے ساتھ ان کے کاروباری

تعلقات ہیں۔ وہاں انھیں اکثر جانا ہوتا ہے۔ جب وہ جاتے ہیں تو فرم کے مالک (مسٹر ونود کمار) کو الرسالہ کا ایک دو مضمون ضرور سناتے ہیں۔ وہ اس کو بہت پسند کرتے ہیں۔ اسی طرح ہزاروں لوگ پورے ملک میں کر رہے ہیں۔

۹۔ نئی دہلی کے ہندی میگزین راشٹریہ وشواس (۳۱ مارچ ۱۹۹۱) نے الرسالہ کا ایک مضمون اپنے کالموں میں نقل کیا ہے۔ اس کا عنوان ہے ہندو واد : پنر جاگرن میں ورودھ بھاس۔ یہ اس مضمون کا ہندی ترجمہ ہے جو الرسالہ (ستمبر ۱۹۹۰) میں صفحہ ۱۴ پر "ایک مشورہ" کے عنوان سے چھپا تھا۔

۱۰۔ حکومت ہند کے منسٹری آف ایجوکیشن کی طرف سے معیاری قومی کتابوں پر دو ضخیم جلدیں چھپی ہیں جو بذریعہ ڈاک ہمیں ملی ہیں :

National catalogue of international standard
books number title 1985-1986
National Catalogue of ISBN titles 1986-1087

ان دونوں مجلدات میں اسلامی مرکز کی کتابوں کی فہرست دی گئی ہے۔ اول الذکر میں اس کو صفحہ ۴۴۲ پر دیکھا جا سکتا ہے اور ثانی الذکر میں صفحہ ۱۸۷ سے ۱۹۰ تک۔

۱۱۔ انووبھا آرگنائزیشن کی طرف سے اودے پور (راج سمند) میں ۱۷۔ ۲۱ فروری ۱۹۹۱ کو ایک کانفرنس ہوئی۔ اس کی تھیم (Peace & non-violent action) تھی۔ اس موقع پر اسلامی مرکز کو مدعو کیا گیا تھا۔ مرکز کی طرف سے ڈاکٹر ثانی اثنین خاں نے شرکت کی۔ اور اسلامی نقطۂ نظر پر ایک مقالہ پیش کیا۔ مقالہ کافی پسند کیا گیا۔

۱۲۔ روم کا ایک ادارہ Comunità di Sant Egidio جو ویٹیکن کے ماتحت ہے۔ اس کے ایک ذمہ دار (Father Paolo Dall'oglio) اسلامی مرکز میں ۲۲ مارچ ۱۹۹۱ کو تشریف لائے انھوں نے اسلام اور مسیحیت کے موضوع پر تبادلہ خیال کیا بعد میں ان کو اسلامی مرکز کا انگریزی لٹریچر پیش کیا گیا۔ انھوں نے اسلامی مرکز کی بعض کتابوں کا اطالوی زبان میں ترجمہ کرنے کی خواہش کی جس کی ان کو اجازت دے دی گئی۔

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو، ہندی اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ ہندی اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملّت کی ذہنی تعمیر میں حصّہ لینا ہے جو آج ملّت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (ہندی اور انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوّت ہے اور ملّت کے اوپر سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو، ہندی یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ ۱۰۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۳ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائیگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحبِ ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کر دے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے تک) پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

زرِ تعاون الرسالہ

ہندستان کے لیے		بیرونی ممالک کے لیے	(ہوائی ڈاک)	(بحری ڈاک)
ایک سال	۶۰ روپیہ	ایک سال	۲۵ ڈالر امریکی	۱۰ ڈالر امریکی
دو سال	۱۱۰ روپیہ	دو سال	۴۰ 〃 〃	۱۸ 〃 〃
تین سال	۱۵۰ روپیہ	تین سال	۵۵ 〃 〃	۲۵ 〃 〃
پانچ سال	۲۴۰ روپیہ	پانچ سال	۸۵ 〃 〃	۴۰ 〃 〃
خصوصی تعاون (سالانہ)	۳۰۰ روپیہ	خصوصی تعاون (سالانہ)	۱۰۰ 〃	— —

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلیشر مسئول نے نائس پرنٹنگ پریس دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی۔۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا۔

RNI 28822/76 □ June 1991 No. 175 □ Rs. 5

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

تذکیر القرآن جلد اوّل	Rs 150/-
” ” جلد دوم	150/-
اللہ اکبر	40/-
پیغمبرِ انقلاب	35/-
مذہب اور جدید چیلنج	40/-
عظمتِ قرآن	25/-
دینِ کامل	45/-
الاسلام	35/-
ظہورِ اسلام	35/-
اسلامی زندگی	25/-
احیاءِ اسلام	20/-
رازِ حیات (مجلّد)	55/-
صراطِ مستقیم	35/-
خاتونِ اسلام	40/-
سوشلزم اور اسلام	35/-
اسلام اور عصرِ حاضر	25/-
حقیقتِ حج	30/-
اسلامی تعلیمات	25/-
اسلام دورِ جدید کا خالق	20/-
رشدیات	
تعمیر کی طرف	8/-
راہِ عمل	25/-
تبلیغی تحریک	20/-
میوات کا سفر	30/-
اقوالِ حکمت	20/-
تعبیر کی غلطی	45/-

دین کی سیاسی تعبیر	15/-
دین کیا ہے	4/-
قرآن کا مطلوب انسان	10/-
تجدیدِ دین	15/-
اسلام دینِ فطرت	5/-
تعمیرِ ملّت	5/-
تاریخ کا سبق	5/-
مذہب اور سائنس	
عقلیاتِ اسلام	30/-
فسادات کا مسئلہ	4/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	4/-
تعارفِ اسلام	4/-
اسلام پندرھویں صدی میں	4/-
راہیں بند نہیں	5/-
ایمانی طاقت	5/-
اتحادِ ملّت	5/-
سبق آموز واقعات	5/-
زلزلۂ قیامت	7/-
حقیقت کی تلاش	5/-
پیغمبرِ اسلام	4/-
آخری سفر	5/-
اسلامی دعوت	5/-
خدا اور انسان	5/-
حل یہاں ہے	8/-
سچا راستہ	4/-
دینی تعلیم	5/-

حیاتِ طیّبہ	5/-
باغِ جنّت	5/-
نارِ جہنّم	5/-

الرسالہ کیسٹ

نمبر ۱ ایمان	25/-
نمبر ۲ جدید امکانات	25/-
نمبر ۳ اسلامی اخلاق	25/-
نمبر ۴ اتحاد	25/-
نمبر ۵ تعمیرِ ملت	25/-
نمبر ۶ سنتِ رسولؐ	25/-
نمبر ۷ میدانِ عمل	25/-
نمبر ۸ پیغمبرانہ رہنمائی	25/-
الرسالہ مجلد فی جلد	75/-

God Arises	Rs 60/-
Muhammad The Prophet of Revolution	65/-
Religion and Science	30/-
Tabligh Movement	20/-
The Way to Find God	5/-
The Teachings of Islam	6/-
The Good Life	6/-
The Garden of Paradise	6/-
The Fire of Hell	6/-
Muhammad The Ideal Character	5/-
Man Know Thyself!	5/-

इन्सान! अपने आपको पहचान	3/-
सच्चाई की तलाश	5/-
पैग़म्बरे-इस्लाम	3/-

Delhi Postal Regd No. D(SE)243
U(SE)12/86

مکتبہ الرسالہ سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳